Literary and Research Journal

ISSN: 2410-1834

Al-Ehsan

Issue # 3 January-June, 2015

Patron in-Chief
Professor Dr. Muhammad Ali
Vice Chancellor

Editor in-Chief
Dr. Humayun Abbas
(Dean, Faculty of Islamic & Oriental Learning)

Editor
Dr. Iftikhar Ahmad Khan

Co-Editor
Dr. Imrana Shehzadi

More Light

Tasawwuf Study Centre,
Department of Islamic Studies & Arabic
Govt. College University, Faisalabad.

Editorial Board

Dr. Muhammad Ishaq Qureshi,
Pir Muhammad Amin-ul-Hasnat Shah
Khawaja Qutab-ud-Din Faridi,
Muhammad Afzal Saeed,
Bushra Fazal
Dr. Ghulam Akbar, Dr. Matloob Ahmad,
Dr. Sher Ali, Hafiz Asif Ali Raza
Fakhar-uz-Zaman, Meerza Amjad Raazi

Advisory Board

National

Dr. Muhammad Akram Virk, Dr. Hafiz Muhammad Sajjad,
Prof. Muhammad Iqbal Mujadadi, Dr. Abdul Ghani Sheikh
Dr. Durmush Bulgur, Dr. Mumtaz Ahmad Sadidi
Prof. Dr. Noor Ahmad Shahtaz

International

Dr. Hafiz Muhammad Munir Al- Azhari (Egypt)
Dr. Abdul Ghaffar Azm (England)
Dr. Aleem Ashraf Jayesi (India), Dr. Mushtaq Tajarvi (India)
Dr. Kausar Mustafa (Bangladesh)
Dr. Muhammad Hussain Muhammadi (Iran)

Price: 400/-

Tasawwuf Study Centre,
Department of Islamic Studies & Arabic
Govt. College University, Faisalabad.
Contact : +92-041-9201559 , Mobile: 0300-6659771
E.mail:drhumayunabbas@gcuf.edu.pk
E.mail: dr.iftikhar747@yahoo.com
0333-6531747/0322-6531747

گذارشات

۱۔ششماہی مجلّہ الاحسان کے لیے اُردو، عربی، فارسی، انگریزی اردو دنیا کی کسی بھی زبان میں غیر مطبوعہ مقالات جو تصوف سے متعلق ہوں، ارسال کئے جا سکتے ہیں۔

۲۔طبع زاد مضامین کے علاوہ دوسری زبانوں کے تصوف کے تحقیقی مقالات کے اُردو تراجم کو بھی شامل کیا جائے گا۔

۳۔مقالات A4 سائز پر ایک جانب کمپوز کروا کر بھیجیں۔

۴۔حروف کا سائز ۱۳ پوائنٹ ہو۔مقالے کے ساتھ انگریزی زبان میں اسکی تلخیص ضرور شامل کی جائے جو اندازاً ۱۰۰ الفاظ پر مبنی ہو۔

۵۔صفحہ کا مارجن دائیں 2.5 بائیں 1.0 اوپر 1.0 نیچے 2.0 ہو۔

۶۔وہی مقالات قابل اشاعت ہوں گے جن کے ہمراہ سی ڈی بھی ہو یا وہ برقی پتہ (ای میل) کے ذریعے بھیجے گئے ہوں۔نیز کمپوزنگ کسی ماہر کمپوزر سے کروائیں۔

۷۔مقالہ کے حواشی وحوالہ جات اور کتابیات پر خصوصی توجہ دی جائے اور اس حوالے سے مروجہ، معیاری طریقہ پر عمل کیا جائے۔

۸۔الاحسان میں کسی مقالہ کی اشاعت کے لیے ادارہ کی طرف سے نامزد کردہ ماہرین کی تائید ضروری ہے، نیز نا قابل اشاعت تحریروں کی مصنفین کو واپسی کی ذمہ داری ادارہ قبول نہیں کرے گا۔

۹۔مدیر مقالہ نگاروں کو ماہرین کی آراء سے آگاہ کرے گا۔نیز اگر کسی مقالہ میں تبدیلی کی ضرورت ہوگی تو اس کے لیے بھی مقالہ نگار سے درخواست کی جائے گی۔

۱۰۔مقالہ پندرہ صفحات سے کسی بھی صورت متجاوز نہ ہو۔

۱۱۔مقالہ اُردو پروگرام Inpage میں کمپوز کیا جائے۔

۱۲۔اشاعت کی صورت میں مقالہ نگار کو مجلّہ کو دو اعزازی نسخے روانہ کئے جائیں گے۔

۱۳۔الاحسان میں اشاعت کے لئے اپنی نگارشات / خطوط / کتابیں اس پتہ پر روانہ کریں۔

مرکز برائے مطالعہ تصوف

شعبہ علوم اسلامیہ وعربی، قائداعظم بلاک، جی سی یونی ورسٹی، فیصل آباد، پاکستان

Contact : +92-041-9201559, Mobile: 0300-6659771

E.mail: dr.iftikhar747@yahoo.com E.mail:drhumayunabbas@gcuf.edu.pk

0333-6531747/0322-6531747

فہرست

تصوف: تلاشِ احسن کی ہمہ گیر تحریک 5

پروفیسر ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی

تصوف از قرآن و حدیث 13

ڈاکٹر مطلوب احمد/ڈاکٹر کنیز فاطمہ

سماجی رویوں کی تشکیل میں صوفیہ کا کردار 35

ڈاکٹر عمرانہ شہزادی

الشیخ غلام مرتضیٰ بیر بلوی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کی تصانیف تعارف و تبصرہ 47

کاشف مبین

تصوف و طریقت کے چہار رنگ کا نظریہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ 77

پروفیسر ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی

میر محمد نعمان بدخشی رحمۃ اللہ علیہ اولین خلیفہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ 96

محمد اقبال مجددی

عصر حاضر کا ایک عظیم صوفی خواجہ فقیر محمد الباروی قدس سرہٗ 124

محمد رمضان نجم باروی

ابن الفارض شاعر صوفي 137

الدكتور كفايت الله همداني/الدكتور حافظ محمد بادشاه

الشیخ محمد عبدالحكيم شرف القادری 151

الدكتور ممتاز احمد سديدی

Political Service of Mehar Ali Shah in Freedom Movement 3

Abdul Qadur Mushtaq

مجلس ادارت:

ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی، پیر محمد امین الحسنات شاہ، خواجہ قطب الدین فریدی، محمد افضل سعید،
بشریٰ فضل، ڈاکٹر غلام اکبر، ڈاکٹر مطلوب احمد، ڈاکٹر شیر علی، حافظ آصف علی رضا،
فخر الزمان، میرزا امجد رازی

مجلسِ مشاورت:

قومی:

ڈاکٹر محمد اکرم ورک، ڈاکٹر حافظ محمد سجاد، پروفیسر محمد اقبال مجددی
ڈاکٹر عبدالغنی شیخ، ڈاکٹر دُرمُش بُلگر، ڈاکٹر ممتاز احمد سدیدی
پروفیسر ڈاکٹر نور احمد شاہتاز

بین الاقوامی:

ڈاکٹر حافظ محمد منیر الازہری (مصر)، ڈاکٹر عبدالغفار عزم (برطانیہ)
ڈاکٹر علیم اشرف جائسی (بھارت)، ڈاکٹر مشتاق تجاروی (بھارت)
ڈاکٹر کوثر مصطفیٰ (بنگلہ دیش)، ڈاکٹر محمد حسین محمدی (ایران)

قیمت: -/400

More Light

شعبہ علوم اسلامیہ و عربی
گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد
Contact : +92-041-9201559 , Mobile: 0300-6659771
E.mail:drhumayunabbas@gcuf.edu.pk
E.mail: dr.iftikhar747@yahoo.com
0333-6531747/0322-6531747

علمی و تحقیقی مجلّہ

ISSN: 2410-1834

الاحسان

شمارہ 3 — جنوری تا جون 2015ء

سرپرست اعلیٰ:

پروفیسر ڈاکٹر محمد علی

(وائس چانسلر، جی سی یونی ورسٹی، فیصل آباد)

مدیر اعلیٰ:

پروفیسر ڈاکٹر ہمایوں عباس

(ڈین، فیکلٹی آف اسلامک اینڈ اورینٹل لرننگ)

مدیر:

ڈاکٹر افتخار احمد خان

معاون مدیرہ:

ڈاکٹر عمرانہ شہزادی

مرکز برائے مطالعہ تصوف

شعبہ علوم اسلامیہ و عربی

جی سی یونی ورسٹی، فیصل آباد، پاکستان

تصوف: تلاشِ احسن کی ہمہ گیر تحریک

پروفیسر ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی ☆

Abstract:

Tasawwuf is the supreme standard of one's spiritual state of Muslim. It represents the very pinnacle of faith. Where Ihsaan is the prestigious branch of faith and a vital component of Tasawwuf. Ihsaan means doing everything in an excellent manner and doing the acts of charity and kindness. The Holy Prophet (ﷺ) says about the Ihsaan: "it is to worship Allah as you are seeing Him while you see Him not yet truly He sees you. In relations to relatives, recognize their rights, be good and help them if they need help. In relations to people in society, whom are weak, needy and poor, be kind and nice to them, even those with whom you disagree in common matters, oblige to them and have no aggression towards them. In relations to the whole world including vegetables, animals and even inanimate things, do not waste, do not misuse, and be thankful to Allah.

Key Words:

Supreme Standard, Spiritual, Pinnacle, Faith, Vital, Component, Charity, Kindness, Society.

☆ صدر مرکزِ تحقیق فیصل آباد

اسلام ایک معاشرتی دین ہے اس لیے اسلامی تعلیمات اپنی روحانی نسبت کے باوجود معاشرتی تعلق کے حوالے سے پہچانی جاتی ہیں۔ معاشرہ ایک ایسا مظہر ہے جس کی تعمیر وتدوین میں انسانی کاوشوں کی کارفرمائی ہے۔ ان کاوشوں کی تہذیب اسلام کا مقصود ہے کہ انسان ہی اسلامی تعلیمات کا مرکزی موضوع ہے۔ انسان دو جہتوں کا حامل وجود ہے، ظاہری یا مادی حیثیت اور باطنی یا روحانی جہت، ان دونوں جہتوں کے توازن اور ان میں مناسب باہمی ربط ہی میں انسانی زندگی کا حسن ہے۔ انسان کا ظاہر حواس سے عبارت ہے کہ حواس کی قوت، عقل وشعور کی راہنمائی میں انسانی زندگی کو فعال اور متحرک رکھتی ہے، یہ انسانی وجود کا خارج ہے، انسان کا باطن، عقیدے اور نظریے کی قوتوں کا امین ہے، اس کی پنہائیاں لامتناہی اور اس کی جولاں گاہ غیر محدود ہے۔ انسان کی ضرورت ہے کہ اس کا ظاہر یعنی مادی وجود بھی متحرک رہے اور اُس کا باطن بھی زندہ اور فعال ہو تا کہ وجود بہر پہلو مہذب اور مرتب رہے۔ دنیا کی نظریاتی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو صاف دکھائی دے گا کہ انسان ظاہر و باطن میں عدم توازن کی وجہ سے دو مختلف جہتوں کا نقیب اور متضاد و معاند گروہوں میں تقسیم رہا ہے، مادہ پرست اور ماورائیت پسند، مادی تصورِ حیات انسان کو ذہنی حوالہ عطا کرتا ہے۔ اس لیے اُس کے تمام رویے اسی تصورِ حیات کی مناسبت سے ترتیب پاتے ہیں، یہ زمینی یا مادی حوالہ کبھی جنس کے روپ میں، کبھی مکانیت کے تصور میں اور کبھی زمانیت کی تنگ ناؤں میں نمودار ہوتا ہے جس سے نسلی، گروہی، ملکی، جغرافیائی حد بندیاں پیدا ہوتی ہیں اور قدیم وجدید کی مصنوعی تقسیم جنم لیتی ہے۔ اس کے برعکس ماورائی اندازِ فکر سے بے عملی، وجود سے نفرت اور معاشرتی فرائض سے فرار کے داعیات کو تقویت ملتی ہے اس طرح انسان، انسانوں سے بے زار، ملک وقوم سے متنفر اور آباد وشاداب دنیا سے کنارہ کش ہونے میں نجات محسوس کرتا ہے۔ اسلام دینِ کامل ہے، اس میں مادی خوشحالی اور روحانی عظمت کو مناسب مقام حاصل ہے، حسناتِ دنیا اور حسناتِ آخرت کی خواہش اس طرح ایک دوسرے میں پیوست ہوگئی ہے کہ پوری اور مکمل انسانی زندگی اس کے دائرۂ اثر میں آ گئی ہے۔ اسلامی تعلیمات، مادہ اور روح کو محیط ہیں۔ ان کا مطلب ایک ایسا انسان ہے جو مادی طور پر قوی پستی ظاہری طور پر پیکرِ جمال اور روحانی حیثیت میں بالیدگیوں کا مظہر اور شرفِ انسانیت کا حامل ہو، یہ بھی یاد رہے کہ اسلامی تعلیمات کے حوالے سے روح مرکزِ حیات ہے اس لیے اُس کے تقاضے مقدم ہیں۔ جسم روح کے تابع ہے اس لیے اس کے تقاضے مؤخر ہیں۔ اسلام کا اِصرار ہے کہ مادی ضابطے، روحانی اصولوں کے مطیع رہیں روح صدر نشین رہے اور مادہ حاضر باش حاشیہ بردار، صوفیہ کرام کی اصطلاح میں روح سوار ہے اور جسم سواری کی دیکھ بھال اور نگہداشت ضروری ہے مگر عظمت و رفعت سوار ہی کو حاصل ہے حفظِ مراتب کی

پاسداری ہی سے انسان کی عظمت وشرافت کو محفوظ کیا جا سکتا ہے اور اسلام کا مقصود ایسا ہی انسان ہے۔

ظاہری حرکات اور مادی افعال کو جب فکر کی راستی نصیب ہو جائے تو اعمال میں حسن اُترنے لگتا ہے اسلام، فکر کی اس راستی کو عقیدے کی پختگی کا عکس قرار دیتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کے مطابق ہی احسان ہے اور اس تلاشِ احسن کی جدوجہد ہی اسلام کا مقصود ہے۔ حدیثِ جبرئیل جسے صحیحین نے روایت کیا واضح کر دیا گیا کہ عبادات جو عبدیت کے اظہار کا وسیلہ ہیں، کا حسن بھی یہی ہے کہ عمل کو باطن کے ایقان کی پناہ نصیب ہو، پوچھا گیا کہ احسان کیا ہے؟ جواب میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فِاِن لَمْ تَكن تَرَاهُ فَاِنَّهُ يَرَاكَ ''(۱) کہ اللہ تعالیٰ کی یوں عبادت کرے کہ جیسے تو اُس کو دیکھتا ہے اور اگر تو نہ دیکھ پائے تو یوں کہ جیسے وہ تجھے دیکھ رہا ہے'' حُسنِ عبادت یہ ہے کہ عبد اپنے معبود کے حضور حاضر ہو تا کہ حضوری کا گداز حاصل کرے اور اگر یہ مقامِ بلند حاصل نہیں۔ نظر اتنی بالغ نہیں کہ روایت کی منزل پالے تو اس یقین کے ساتھ عبادت ہو کہ وہ تو دیکھتا ہے۔ کوئی فعل جب اُس ذات کے حضور ادا ہو جس کے حکم کی تعمیل میں انجام پا رہا ہے تو وہ عملی وصف ظاہری حرکات کا مجموعہ نہیں رہتا، باطن کا عکس جمیل بھی ہوتا ہے اور اگر یہ یقین ہو جائے کہ دیکھنے والی ذات ظاہر سے کہیں بڑھ کر باطن کی لرزشوں کا بھی مشاہدہ کر رہی ہے تو عمل، خلوصِ نیت کا مظہرِ اتم بن جاتا ہے۔ پھر اعمال کا ہیولہ مختلف بھی ہو، حرکات وسکنات متفاوت بھی ہوں، تلاشِ احسن، کا عمل ہمہ وقت جاری رہتا ہے۔ اسلام اس کو احسان کہتا ہے اور ہر فعل وعمل کو اس کے تابع رکھنے کا حکم دیتا ہے۔ اس لیے کہ اسلام دینِ احسان ہے، مقصود ہر بہتر کی تلاش ہے، عبادات میں بھی، معاملات میں بھی، فرد میں بھی اور اجتماع میں بھی حتیٰ کہ اُن اعمال ومعاملات میں بھی جہاں بظاہر اس کا وجود ناممکن نظر آئے، قتل ایک بھیانک فعل ہے اس سے اجتناب کا حکم دیا گیا مگر جب برتر مقاصد کے حصول کے لیے یہ ناپسندیدہ عمل ناگزیر ہو جائے کہ کسی ناسور کا کاٹنا لازم ٹھہرے تو اس میں بھی احسن کی تلاش جاری رہی، جانوں کا ذبح کرنا ضرورتِ حیات کا لازمی نتیجہ ہے اس ضرورت کو بھی ''حُسنِ عمل'' سے مربوط کیا گیا۔ صحیح مسلم کی حدیث ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''إِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ الْاِحْسَانَ عَلىٰ كُلِّ شَیْ ءٍ، اذا قَتَلْتُمْ فَاحْسِنُوا الْقِتْلَةَ، وَإِ ذَا ذَبَحْتُم فَاَحْسِنُوا الذِّبْحَةَ وليحُدَّ أَحَدُكُمْ شَفْرَتَهُ وَلْيُرِحْ ذَبِيْحَتَهُ۔ ''(۲)

بے شک اللہ تعالیٰ نے ہر چیز میں احسان کا حکم دیا ہے، جب تم کسی کو قتل کرو تو احسن طریق سے اور جب تم کوئی جانور ذبح کرو تو عمدہ تر انداز سے، تمہیں چاہیے کہ دھار کو تیز کر لو اور جانور

کو آرام پہنچاؤ۔

غور فرمائیے کہ اگر صرف ذبح کرنا ہی مطلوب ہے تو وہ کند چھری سے بھی ہوسکتا ہے مگر اس میں شقاوت کا عنصر ہوگا۔ ایسے اگر کسی عضو کا کاٹنا ناگریز ہو جائے تو سرجن کند آلے سے بھی ایسا کر سکتا ہے مگر اس طرح کٹنے کے قابل عضو بھی کئی گنا زیادہ تکلیف کا باعث بنے گا۔ اعمال کا حسن یہ ہے کہ ادائیگی کا حق ادا ہو، حدیث مبارک میں مثلہ یعنی انتظام کی خاطر اعضاء بدن منع کیا گیا جہاں تک فرمایا گیا کہ ''لَوْ کَانَ بِاٰتکَلْبِ الْعَقُو'' اگر چہ ایسا عمل کاٹنے والے باولے کتے کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو، معلوم ہوا اسلام اعمال کے بجا آوری میں شائستگی، متانت اور رحم دلی کی کارفرمائی کا خواہاں ہے، حسنِ عمل کی معراج ذاتِ رسالت پناہ ﷺ کے اسوہ میں ہے کہ آپؐ کی ذات میں ظاہر و باطن کی تمام رعنائیاں موجود ہیں، آپؐ کا ہر عمل مجسم حسن ہے اور آپؐ کا ہر رویہ، تلاشِ حسن کے راہ نوردوں کے لیے راہنما ہے اب حسنِ عبادت ہو یا حسنِ نظر، اس کی بھیک اُس حسنِ تمام کی بارگاہ سے حاصل ہوتی ہے اور آپ کے ارشادات کی روشنی ہی میں تلاشِ احسن کی راہ آسان ہوتی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس حسنِ عمل کے ابتدائی حوالے ہیں کہ ظاہر و باطن کی حسنات کے امین ہیں اسی لیے اُنہیں آسمانِ ہدایت کے ستارے کہا گیا، حسنِ عمل کا یہ سفر اسلامی تعلیمات کے سایوں میں جاری رہا۔ صوفیہ کرام اس راہ کے مسافر اور اسی اِحسان کے طلب گار ہیں کہ وہ شاہراہ حیات ہر حسن نیت اور حسنِ عمل کے نشان ہیں، ان بابرکت افراد کے ہاں علم، عمل میں ڈھلا اور عمل اِحسان کے جذبوں کا امین بنا۔

انسانی فطرت میں جذب و انجذاب کے داعیات بڑے شدید ہیں، مادی احتیاج کا جبر آجائے تو روحانی منزلت نظر انداز ہو جاتی ہے اور ماورائیت پسندی کا انہماک بڑھے تو معاشرتی ضابطے فراموش ہو جاتے ہیں یہ وارفتگی اور ہمہ تن گرویدگی کا شاخسانہ ہے کہ حد اعتدال سے انحراف ہونے لگتا ہے۔ کبھی امید خودسر بنا دیتی ہے تو کبھی خوف بے دست و پا کر دیتا ہے اس لیے متنبہ کر دیا گیا کہ نجات کا راستہ سلامتی کا سفر اور کامیابی کی منزل، خوف و رجاء کے درمیان ہے اسی لیے قرآنِ مجید نے اپنے اسلوبِ تلقین کو رجاء اور خوف کے دونوں رخوں سے آراستہ کیا۔ عذاب کا ہولناک نقشہ کھینچا تو متصلاً انعام و اکرام کی نوازشات کا بھی بیان ہوا تا کہ خوف فرار کی راہ نہ دکھائے اور رجاء بے عملی کی ترغیب نہ دے، حضور اکرم ﷺ کا اسوۃ اسی توازن کا آئینہ دار ہے۔ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے بعض نے دنیا سے لاتعلقی کی خواہش کا اظہار کیا تو تنبیہ فرمادی، حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ نے عرض کیا ''یا رسول اللہ میرا دل کہتا ہے میں دنیا چھوڑ دوں، پہاڑوں میں جا کر رہبانیت اختیار کرلوں، زمین میں گھوموں اور مال و دولت سے دست بردار ہو جاؤں، بیوی کو طلاق دے دوں،

گوشت نہ کھاؤں اور خوشبو نہ لگاؤں۔'' ترکِ دنیا کی اس خواہش کا سن کر نبی رحمت ﷺ نے ایسا کرنے سے منع فرما دیا اور معاشرتی روابط کو برقرار رکھنے کی تلقین فرمائی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عنصرِ خیر میں اُسوہ رسول ﷺ کا یہ توازن غالب رہا مگر جب ملکی حالات عدم توازن کا شکار ہوئے تو بعض متوازن ذہن بھی بے رغبتی محسوس کرنے لگے۔ دین و دنیا کا بعد گھمبیر ہوتا گیا تو وہ اکابر جو اصلاحِ خلق کے مشن پر مامور تھے، مادی افراتفری سے ہٹ کر اصلاحی مراکز قائم کرنے لگے تاکہ عملی جدوجہد سے فرار کی حوصلہ افزائی نہ ہو اور دین متین کے معاشرتی تقاضے نظرانداز ہو جائیں۔ اس طرح زاویوں، خانقاہوں اور غزلت خانوں کی دنیا آباد ہوئی عقل کی تہذیب علماء کے ہاتھوں ہوئی تو دل کی تنویر صوفیہ کے سوزِ دل سے ان روحانی مراکز کا ہی نتیجہ تھا کہ سیاسی حالات کی ابتری کے باوجود روح کے تربیت کدے آباد رہے۔ یہ طریقِ اصلاح تصوف کہلایا اور اس راہِ عمل کے شناور صوفی کے لقب سے معروف ہوئے، یہ کوئی اجنبی تحریک نہ تھی اور نہ ہی فراریت کی دعوت تھی بلکہ یہ ہمہ جہت اصلاح، ہمہ پہلو عمل اور سراسر اسلامی تعلیمات کی حامل جدوجہد تھی کہ قوم میں قوتِ عمل کی افزائش ہو اور نظریاتی استحکام کی ترسیخ ہو۔

تصوف داخل کی اصلاح، باطن کی تہذیب اور خارج مظاہر کی تربیت کا ایک وقیع ادارہ ہے، اس سے معاشرتی حسن اور سماجی جمال کی ترویج ہوتی ہے، دل، زبان اور عمل کو یک رنگی نصیب ہوتی ہے، باطن کی نورانیت اعمال میں ڈھل کر تابانیوں کے فروغ کا ذریعہ بنتی ہے یہ ہمہ گیر تحریک، مقاصد کے حوالے سے باہمی تعاون اور ملی یک نیتی کی نوید تھی یہی وجہ تھی کہ صوفیہ کے مختلف گروہوں میں مجادلت کی فضا پیدا نہ ہوئی، باہمی اکرام کی حفاظت کی گئی اور مناظرانہ چپقلش کی کوئی ضرورت پیدا نہ ہوئی، حسنِ تمام سے رشتہ مضبوط رہا اس لیے نظروں کے تفاوت کے باوجود نظری انتشار پیدا نہ ہوا۔ تصوف کے جملہ مدارج، اصلاح و فلاح کے نقیب رہے، محبت کی افزونی، اعتماد کی بالیدگی اور دعوتِ رائے کی پاکیزگی قائم رہی! ہاں یہ ضرور ہوا کہ بعض کوتاہ بین اس حسن کی رفوت کا ادراک نہ کر سکے۔ اُن کے اندر نورِ یقین کی لَو فروزاں نہ ہوئی مگر انہوں نے دنیاوی فعارات، ذاتی اغراض اور گروہی تعصّبات کے زیرِ اثر صوفیہ کی صفوں میں گھسنے کی کوشش کی مگر یہ تمام تر کوشش لا حاصل رہی کہ کبھی بہروپ، روپ کا تقدس حاصل نہ کر سکا اس ممکنہ خطرہ کے پیش نظر صوفیہ متعلقین کو متنبہ کرتے رہے حتیٰ کہ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کو کہنا پڑا:

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست
پس بہر دستے نہ باید داد دست

حضرت داتا گنج بخشؒ نے اس آمیزش کو محسوس کیا تو واضح کر دیا کہ تصوف کے حوالے سے انسانوں کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ صوفی: یہ وہ شخص ہے جو آپ سے فانی اور حق کے ساتھ ہو، اپنی طبیعت کے قبضے سے رہائی پائے ہوئے ہو اور حق کے ساتھ ملا ہوا ہو۔

۲۔ متصوف: وہ متکلف صوفی جو مجاہدے اور تکلف سے صوفیاء کی صف میں شامل ہو۔

۳۔ مستصوف: وہ انسان جو دنیاوی مال ومتاع اور عزت کو حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو صوفی ظاہر کرے، صفا اور تصوف سے اُس کا کوئی تعلق نہ ہو، یہ وہ جبلی صوفی ہے جو صوفیہ کے نزدیک حقیر مکھی کی طرح ہے جو آلودگی پسند ہے مگر یہی شخص غیر لوگوں کے سامنے بھیڑیا ہے کہ اُن سے مال ہتھیا لیتا ہے۔

ان ارشادات سے ظاہر ہے کہ صوفی تو صفائے قلب کا حامل وہ وجود ہے جس سے ہر لحہ خیر کی توقع ہوتی ہے۔ وہ ذاتی اغراض سے محفوظ، بے لوثی کے حصار میں ہوتا ہے۔ مادی احتیاج کی آلودگی سے مستثنٰی ہے کہ ہمہ وقت حاضری دربارِ الٰہی کی کیفیت میں رہتا ہے۔

صوفیہ کی زندگیوں پر نظر ڈالی جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اُن کا دل غیر کے خیال سے پاک، غیر کی خوشنودی سے معرّا اور خالق کی رضا سے مملوٴ ہوتا ہے، اُن کو خیالات کی یکسانی اور جذبات کی یکسوئی حاصل ہوتی ہے کائنات کی بوقلمونی میں بھی وحدت کی طلب اُن کا مشن ہے اور بقول حضرت شمس تبریزی:

دوئی از خود بدر کردم یکے دیدم دو عالم
یکے دیدم یکے بینم یکے خواہم یکے دانم

اور وہ یک کون ہے، پکار اٹھتے ہیں:

ھو الاوّل ھو الآخر ھوالظاھر ھوالباطن
بجز یا ھُو ، ھو ھو دگر چہرے نمی دانم

یہ وحدتِ آشنائی اُن کا رویہ بن جاتا ہے۔ مخلوق کی کثرت میں وہ خالق کی یکتائی تلاش کر لیتے ہیں اس لیے کہ اِلٰھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ ہر ایمان نظریاتی مشق ہی نہیں زندگی کی واردات ہوتا ہے، اللہ واحدٌ سے کی منزل کا شعور ملتا ہے اور یہ شعور وحدتِ نسل انسانی ہر یقین کا باعث بنتا ہے، ایک باپ کی اولاد ہونے کے ناطے قرب زمینی حاصل ہوتا ہے اور ایک خالق ورب کے یقین سے انسانیت پر اعتماد قائم ہوتا ہے۔ یہ قرب اور یہ

اعتماد معاشرت میں حسنِ خلق، حسنِ عمل اور حسنِ روابط کا محرک ہوتا ہے۔ تاریخ کے جھروکوں میں جھانکیے تو ایسے مردان باصفا اور صوفیہ بے ریا کے کئی قافلے نظر آتے ہیں ان قافلوں میں ایک ایسا قافلہ سالار بھی ہے جو علم کا منبع، حلم کا مخزن، مجاہدے کا امام اور اشاعتِ دین کا روشن حوالہ ہے۔ ایک ہزار سال قبل کی سیاسی معاشرے اور سماجی حالات نگاہ میں رکھیے، برصغیر کی توہم پرستی، صنم آشنائی اور سماجی تفریق کو بھی پیشِ نظر رکھیے، کیا کسی مذہب کو اس ماورائیت پسند سرزمین پر قدم جمانے کا موقع ملا، ہندو کی ملفوف چرب زبانی اور بے حد وحساب خودنگری کسی کے لیے کوئی موافق فضا پیدا کرنے کے لیے معاون بنی، ایسی اجنبی فضا اور ایسے ماند ماحول میں تلاشِ احسن کا ایک خوگر حسنِ معاشرت اور حسنِ عمل کی اصلاح لیے میدانِ عمل میں آیا تو کیا ہوا؟ دشمنی کا توڑ دوستی کے فروغ سے تو ہم پرستی کا دفاع یقین کی سپہر سے تقسیمِ غلِ آدم کے زہر کا وحدتِ انسانیت کے تریاق سے ہوا، تاریکیاں کافور ہوئیں نظریات کی دھند سمٹنے لگی، رویوں کی تلخی معاشرت کی شیرینی سے پسپا ہوئی، نہ مال کا سہارا، نہ خاندانی وجاہت کا تعاون، نہ وعدوں کی جلترنگ اور نہ آسائشوں کی چکاچوند، ایک قوت، ایک ہتھیار اور ایک ہی ضرب کاری، حسنِ وقت کی نشاندہی، حسنِ عمل کی ترویج اور حسنِ معاشرت کا پرچار، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول کی صداقت سب پر آشکار ہوئی کہ "اَلنَّاسُ اَبنَاءُ مَایُحسِنُوْنَ" لوگ اعمالِ حسن کے حامل افراد کے غلام ہوتے ہیں قرآنِ مجید کے اس ارشاد کہ "اِدْفَعْ بالتی هِیَ أَحْسَنُ"(۳) دفاع کرو تو احسن طریق سے اور اگر معاملہ بگڑ جائے اور مخاصمانہ فضا قائم ہو جائے تو ایسے میں بھی "وَ جَادِلْهُم بِالَّتِیْ هِیَ أَحْسَن "(۴) اور جدال کرو مگر احسن انداز سے۔ معاملات کتنے بھی الجھے ہوئے ہوں اور بظاہر حسن وخوبی کا وجود ناممکن دکھائی بھی دے پھر بھی احسن کی تلاشی جاری رہے اور بہر حال رُخ اِحسان کی جانب رہے، اِحسان زندگی کا ایک گوشہ نہیں مجموعی حوالہ ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت اس پر گواہ ہے کہ آپ ہمہ تن احسان احسن تقویم انسان کے لیے اُسوۂ حسنہ ہیں، حضرت داتا گنج بخش علی الہجویری رحمۃ اللہ علیہ نے اس اسوہ کو اپنے وجود کا حصہ بنایا۔ احسان کی راہیں آسان بنانے کی تگ ودو کرتے رہے اس کا اثر یہ ہوا کہ مادیت میں لتھڑا ہوا انسان، معاندین کے صفوعین کا سالار اور آنے والے مجسم احسان سے پرخاش رکھنے والا وجود بھی حسنِ خلق کا گھائل ہوا اور شیخ ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کو دید پسندی کی شکل میں اپنے حسنِ عمل شہادت کے لیے ایک نایاب گواہ حاصل ہوا۔

آج بھی ضرورت اسی حسنِ عمل کی ہے۔ ہم خیر، ہم جہت اصلاح، سب کے لیے دردمند دلی اور سب کے دکھوں کا مداوا کرنے والا نرم درکار ہے۔ دہشت و وحشت کے سیاہ پردوں میں راہِ حیات کے بھٹکتے مسافروں کے لیے حسنِ نظر اور حسن عمل کی ضیا درکار ہے۔ آیئے حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے وقدانوار پر

احسن کی تلاش کا عہد کریں۔اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے۔(آمین)

OOO

حوالہ جات

۱۔ صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب سوال جبریل النبی ﷺ عن الایمان والاسلام والاحسان وعلم الساعۃ، رقم الحدیث:۵۰

۲۔ صحیح مسلم، کتاب الصید والذبائح وما یؤکل من الحیوان، باب الأمر باحسان الذبح والقتل وتحدید الشفرۃ، رقم الحدیث:۱۹۵۵

۳۔ سورۃ فصلت:۳۴

۴۔ النمل:۱۲۵

OOO

تصوف از قرآن وحدیث

ڈاکٹر مطلوب احمد ☆
ڈاکٹر کنیز فاطمہ ☆☆

Abstract:

Tasawwuf is a very special part and branch of Faith which is carried to perfection. The Holy Peophet (SAWW) describes it as "Ihsan" in His tradition and "Tazkia" as the Holy Qur'an states and Tasawwuf as it is known in common utherance. This word has been derived from the Arabic word "Soof" (wool) or from "Safa" means cleanliness. It brings in as individual. The creation of real living consciousness of Allah Ta'la. Aconsciounsness so strong and vivid as if one had actually seem him. When this is consciousness becomes complete, it creates a bond of loyalty with Allah Ta'la, that fills the heart with his rememberance. The capital sources of Tasawwuf are The Holy Qur'an and Sunnah of the Holy Prophet (SAWW). The practical life of the companions of the Holy Prophet (SAWW) takes us to its reality. In this Article the importance, need and Vitality of Tasawwuf have been given in light of the verses of the Holy Qur'an and traditions of

☆ ایسوسی ایٹ پروفیسر گورنمنٹ کالج آف کامرس فیصل آباد
☆☆ ایس ایس ایس گورنمنٹ گرلز ہائر سیکنڈری سکول مری روڈ راولپنڈی

the Holy Prophet (SAWW).

Key Words:

Tasawwuf, Part of Faith, Perfection, Tazkiah, Utherance,Consciousness,Sources, Importance.

قرآن مجید بنیادی طور پر تمام علوم کا منبع و مآخذ ہے انسان کی راہنمائی کیلئے زندگی کے تمام شعبوں کیلئے ہدایت فراہم کرتا ہے۔خواہ ان کا تعلق ظاہری زندگی سے ہو(جسے شریعت کہتے ہیں) یا باطنی زندگی سے (جسے طریقت کہتے ہیں) قرآن مجید سے تصوف کا اثبات اس سے بڑھ کر اور کیا ہوسکتا ہے کہ شریعت کا مقصد ہی حصول تقویٰ قرار دیا گیا ہے،انسان کی پیدائش کا مقصد اللہ تعالیٰ کی عبادت بیان کیا گیا ہے۔ارشاد الٰہی ہے:

"وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۔"(۱)

(اور میں نے جنات اور انسانوں کو محض اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ صرف میری عبادت کریں۔)

اللہ تعالیٰ کی عبادت کا مقصد پرہیز گاری اور اپنے دامن کو برائیوں سے پاک وصاف کرنا ہے اور یہی تصوف کا مقصود ہے۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"يٰاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۔"(۲)

(اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمھیں اور تم سے اگلوں کو پیدا کیا تا کہ تمھیں پرہیز گاری ملے۔)

قرآن مجید کا مقصد اپنے قارئین اور ماننے والوں کا تقویٰ کی دولت سے سرفراز کرنا ہے اور تصوف میں اس عظیم مقصد کے حصول کیلئے جو طریقے اختیار کئے گئے ہیں انکی طرف قرآن کریم میں واضح اشارات ملتے ہیں اور کہا گیا ہے کہ متقی تو اصل میں اولیاء اللہ ہیں لیکن لوگ اس حقیقت سے واقف نہیں ہیں۔فرمان ربی ہے:

"اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗۤ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۔"(۳)

(اس کے اولیا تو پرہیز گار ہیں لیکن ان میں اکثر کو علم نہیں۔)

اہل تصوف کی خصوصیت تقویٰ بیان کرنے کے بعد قرآن مجید نے یہ خوشخبری بھی سنائی کہ قربت الٰہی کا اعزاز بھی انھی کو حاصل ہے ہوتا ہے۔ارشاد الٰہی ہے:

"وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ۔"(۴)

(اور اللہ سے ڈرو اور جان رکھو کہ اللہ متقین کے ساتھ ہے۔)

تقویٰ حاصل کرنے کے بعد محبوبیت الٰہی بھی حاصل ہو جاتی ہے ارشاد کریمی ہے:

"اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْن۔"(۵)

(بیشک اللہ تعالیٰ متقین سے محبت کرتا ہے۔)

تصوف میں اللہ تعالیٰ کو خوف، محبت، قربت اور توکل علی اللہ جیسی خصوصیات پیدا کرنے کیلئے مراقبہ اور دیگر انداز عبادت کو اپنایا جاتا ہے۔ قرآن مجید نے اس طرح کے اوصاف کے حامل افراد کو اہل ایمان میں شامل کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ وَاِذَا تُلِیَتْ عَلَیْھِمْ اٰیٰتُہٗ زَادَتْھُمْ اِیْمَانًا وَّعَلٰی رَبِّھِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ۔"(۶)

(ایمان والے وہی ہیں کہ جب اللہ کو یاد کیا جائے تو ان کے دل ڈر جائیں اور جب ان پر اس کی آیتیں پڑھی جائیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے رب پر ہی بھروسہ کرتے ہیں۔)

تصوف اصل میں اپنے نفس کو خواہشات دنیوی سے محفوظ رکھنے کا ہی نام ہے۔ اور اسی کو تزکیہ نفس کہا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

" قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی وَذَکَرَ اسْمَ رَبِّہٖ فَصَلّٰی بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃُ خَیْر "وَّ اَبْقٰی۔"(۷)

(وہ فلاح پا گیا جس نے تزکیہ (نفس) کر لیا۔ اور اپنے رب کے نام کا ذکر کیا اور نماز پڑھی مگر تم لوگ دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت بہتر ہے اور باقی رہنے والی ہے۔)

ذکر اور شکر دو ایسے فضائل ہیں جو اہل تصوف کے پاس وافر ہوتے ہیں اور انھی دو کو زیادہ کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے۔

"فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ وَاشْکُرُوْا لِیْ وَلَا تَکْفُرُوْنِ۔"(۸)

(تم مجھے یاد کرو میں تمھیں یاد کروں گا اور میرا شکر ادا کرتے رہو اور ان کا انکار مت کرو۔)

ذکر الٰہی ہی اصل میں وہ دولت ہے جو اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں کے پاس ہوتی ہے جس سے ان کے قلوب محبت الٰہی اور معیت رحیم سے منور ہوتے ہیں ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی یاد بسیرا کر لیتی ہے تو پھر

ان پر کوئی بھی دنیوی کاروبار (تجارت وبیع) ان کو ذکر الٰہی سے غافل نہیں کرسکتا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"رِجَال" لَّا تُلۡهِيۡهِمۡ تِجَارَة" وَّلَا بَيۡع" عَنۡ ذِكۡرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيۡتَآءِ الزَّكٰوةِيَخَافُوۡنَ يَوۡمًاتَتَقَلَّبُ فِيۡهِ الۡقُلُوۡبُ وَ الۡاَبۡصَارُ۔"(۹)

(وہ لوگ جنھیں تجارت اور خرید وفروخت اللہ کے ذکر اور نماز قائم کرنے اور زکوۃ کی ادائیگی سے غافل نہیں کرتی اس دن ڈرتے ہیں جس دن بہت سے دل اور بہت سی آنکھیں الٹ جائیں گی۔)

پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی لکھتے ہیں:

''اولاد آدم دو گروہوں میں بٹ گئی ہے ایک گروہ حزب اللہ اور دوسرا حزب الشیطن حزب اللہ میں اللہ تعالیٰ کے مخلص بندے شامل ہیں جن پر شیطان کا کوئی بس نہیں چلتا اور حزب الشیطن میں وہ لوگ ہیں جو شیطان کی پیروی کرتے ہیں اور ذکر الٰہی سے منہ موڑ لیتے ہیں ۔حزب اللہ کا گروہ فلاح یافتہ ہے حزب الشیطن والے خسارہ میں رہیں گے۔''(۱۰)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"اِسۡتَحۡوَذَ عَلَيۡهِمُ الشَّيۡطٰنُ فَاَنۡسٰهُمۡ ذِكۡرَ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ حِزۡبُ الشَّيۡطٰنِ اَلَاۤ اِنَّ حِزۡبَ الشَّيۡطٰنِ هُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ۔"(۱۱)

(ان پر شیطان غالب آ گیا تو انھیں اللہ کی یاد بھلا دی وہ شیطان کا لشکر ہے خبردار بیشک شیطانی لشکر ہی خسارے میں ہے۔)

دوسری جگہ پر قرآن مجید حزب اللہ کا درجہ بھی بیان کیا گیا اور ان لوگوں پر انعامات ربانی کا واضح اعلان ان الفاظ میں کر دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيۡ قُلُوۡبِهِمُ الۡاِيۡمَانَ وَاَيَّدَهُمۡ بِرُوۡحٍ مِّنۡهُ وَيُدۡخِلُهُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِيۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡهُ اُولٰٓئِكَ حِزۡبُ اللّٰهِ اَلَاۤ اِنَّ حِزۡبَ اللّٰهِ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ۔"(۱۲)

(یہ وہ لوگ ہے جن کے دلوں میں (اللہ نے) ایمان نقش کر دیا اور اپنی طرف سے روح کے ذریعے ان کی مدد کی اور انھیں اس جنت میں لے جائیگا جس کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں ان میں ہمیشہ رہیں گے اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی ہوئے یہ اللہ کا گروہ ہے خبردار بے شک اللہ کا گروہ ہی فلاح یافتہ ہے۔)

یہی مخلصین اور صالحین ہیں جنھوں نے ہمیشہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات وارشادات پر عمل کیا اور یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے انعام واکرم کے نزول کے بہت بڑے مرکز بن جاتے ہیں۔

”وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا۔“(۱۳)

(اور جو بھی اللہ اور اسکے رسول ﷺ کی اطاعت کرے تو اسے ان کا ساتھ ملے گا جن پر اللہ نے فضل (انعام) کیا یعنی انبیاء اور صدیق اور شہید اور نیک لوگ اور یہ کیا ہی اچھے ساتھی ہیں۔)

قرآن مجید میں دوسری جگہ پر ان صالحین کے فضائل ودرجات کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے اس طرح فرمایا:

”اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۔“(۱۴)

(خبردار اللہ کے ولیوں پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ کوئی غم وہ جو ایمان لائے اور متقی ہیں انھیں خوشخبری ہے اس دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی اللہ کی باتیں تبدیل نہیں ہوا کرتیں۔ یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔)

تزکیہ نفس ہی صوفیہ کا اوڑھنا اور بچھونا ہوتا ہے اسی کی عملی تصویر ہوتے ہیں اور اسی کی تبلیغ ان کا مقصد اور منزل ہوتی ہے انسان کیلئے تزکیہ نفس ایک ایسی مطلوبہ نعمت ورحمت ہے جس کو لوگوں تک پہنچانے کیلئے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ اور قرآن کی تلاوت کا انتخاب کیا۔ ارشاد خداوندی ہے:

”هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِى الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ۔“(۱۵)

(وہی (اللہ) جس نے امیوں میں ایک رسول انھی میں سے مبعوث فرمایا جو انھیں اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے اگر چہ اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں تھے۔)

توکل علی اللہ تصوف کی بہت بڑی خوبی ہے وہ لوگ خوشی غمی، راحت ورنج، فقیری وامیری ہر حالت اور زندگی کے تمام شعبہ جات میں توکل کو اپنی زندگی کا زینہ بناتے ہیں توکل کا حکم اللہ نے خود دیا ہے اور مومنوں

کی پہچان ہے۔ارشادربانی ہے:

"وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْن۔"(۱۶)

(اوراللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرواگرایمان دارہو۔)

"فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْن۔"(۱۷)

(اور جب جب آپ (کسی بات کا) کاارادہ کرلیں تو پھراللہ پر توکل کریں۔)

بیشک اللہ تعالیٰ توکل کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ایک اور مقام پرفرمایا:

"وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ۔"(۱۸)

(اور جواللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتا ہےتواس کیلئے کافی ہے۔)

صوفیہ کے ہاں بیعت کا تصور بھی موجود ہے بیعت کے ذریعہ شیخ کامل اپنے مرید کونورسکینہ کے حصول کے راستے بتاتے ہیں جس پر چل کر طالب طریقت روحانی طور پر اعلیٰ مقام حاصل کر لیتا ہے۔صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین نے بھی آنحضور ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی جسے قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

"اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ۔"(۱۹)

(بیشک جولوگ تمھاری بیعت کرتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ ہی سے بیعت کرتے ہیں ان کے ہاتھوں پراللہ تعالیٰ کاہاتھ ہے۔)

ذکرالٰہی صوفیہ کی غذا ہوتی ہے اور ذکرالٰہی کی وجہ سے انھیں اطمینان قلب نصیب ہوتا ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْب۔"(۲۰)

(وہ جوایمان لائے اوران کے دل اللہ تعالیٰ کی یاد سے چین پاتے ہیں سن لو! اللہ تعالیٰ کی یاد ہی میں دلوں کا چین ہے۔)

"فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْن۔"(۲۱)

(پس اہل ذکر سے پوچھواگرتم نہیں جانتے۔)

آیات قرآنیہ کے مطالعہ سے یہ بات عیاں ہوگئی کہ ذکرالٰہی توکل علی اللہ تزکیہ نفس،سکون قلب قربت الٰہی،معیت الٰہی،تقوی،صبروشکراورفلاح دنیا آخرت ہی انسان کی فانی زندگی کی کامیابی کیلئے ضروری ہیں جن کی تاکید بھی قرآن مجید نے کی اور یہی تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کی زندگی کا حصہ بن جاتی ہیں۔

تصوف ازروئے حدیث:

تصوف کی ضرورت اہمیت قرآن مجید کی روشنی میں مطالعہ کے بعد یہ بھی لازم ہے کہ اسکو حدیث مبارک کے تحت بھی دیکھا جائے کیونکہ حدیث وسنت بھی شریعت کا دوسرا بڑا ماخذ ہے۔

احادیث نبوی میں اولیاء وصالحین کی اللہ تعالیٰ سے قربت اور محبت کی منظوری کی سند اس وجہ سے دی گئی ہے کہ صالحین ذکر الٰہی اور عبادت نفلی کی وجہ سے اس منزل محبوبیت کو حاصل کر لیتے ہیں اور ایسے اولیاء سے دشمنی رکھنے والوں کو خود اللہ تعالیٰ جنگ کی دعوت دیتا ہے۔ حدیث نبوی ﷺ ہے:

"عن ابی هريرة[۲۲] قال: قال رسول الله ﷺ ان الله قال: من عادى لي وليا فقد اذنتهٔ بالحرب، وما تقرب الیی عبدی بشی الی احب الیی مما افترضت عليه، ومايزال عبدی يتقرب الی بالنوافل حتیٰ احبهٔ فاذا احببتهٔ: كنت سمعه الذی يسمع به، وبصره الذی يبصر بهٖ ويدهٗ التی يبطش بها، ورجله التی يمشی بها، وان سالنی لاعطينه، ولئن استعاذنی لاعيذنهٗ، وماترددت عن شئ ء انا فاعلهٗ ترددی عن نفس المومن يكره الموت انا اكره مسائته۔"[۲۳]

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: جو میرے کسی ولی سے دشمنی رکھے میں اس سے اعلان جنگ کرتا ہوں اور میرا بندہ ایسی کسی چیز کے ذریعے میرا قرب نہیں پاتا جو مجھے فرائض سے زیادہ محبوب ہو اور میرا بندہ مسلسل نفلی عبادات کے ذریعے میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں اور جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کے کان (کی سماعت) بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اسکی آنکھ (کا نور) بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہو اور اس کے ہاتھ (کر گرفت) بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کے پاؤں (کی توانائی) بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔ اگر وہ مجھ سے سوال کرتا ہے تو میں اسے ضرور عطا کرتا ہوں اور اگر وہ میری پناہ مانگتا ہے تو میں ضرور اسے پناہ دیتا ہوں میں نے جو کام کرنا ہوتا ہے اس میں کبھی اس طرح متردد نہیں ہوتا جیسے بندہ مومن کی جان لینے میں ہوتا ہوں (ایسے میں کہ) اسے موت پسند نہیں اور مجھے اس کی تکلیف پسند نہیں۔

مسلسل نفلی عبادات کے نتیجہ میں صوفیہ کو اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ پھر ایسے اپنے خاص بندوں کو ایسے راستوں پر جانے سے روک دیتا ہے جن کو اختیار کرنے سے فساد اور غرور حاصل ہو۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"عن انس بن مالک (۲۴) عن النبی ﷺ عن ربہ تعالی تقدس قال: من اھان لی ولیا فقد بارزنی بالمحاربۃ، وماترددت فی شییٍ انا فاعلہ ماترددت فی قبض نفس المومن، لانہٗ یکرہ الموت، وانا اکرہ مساء تہ۔ ولا بدلہٗ منہ وان من عبادی المومنین من یرید با با من العلم فاکفہٗ عنہ، لا یدخلہٗ عجب فیفسد لذلک وما تقرب الی عبدی بمثل اداء ما افترضتہٗ وما یزال عبدی یتنفل لی حتی احبہٗ فاذا احببتہٗ کنت لہ سمعا، وبصرا، ویدا ومؤیدا، دعانی فاجبتہ وسالتی فاعطیتہ، ونصح لی فنصحت لہٗ۔۔۔ الحدیث (رواہ ابن ابی دنیا ابو نعیم والطبرانی مختصرا والقضاعی)۔" (۲۵)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ حضور اکرم ﷺ سے اس چیز کے بارے میں روایت کرتے ہیں جو آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے سنی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ جس نے میرے کسی ولی کی اہانت کی گویا اس نے میرے ساتھ اعلان جنگ کیا اور میں کسی چیز میں جتنا تردد نہیں کرتا جسے میں کرنے والا ہوتا ہوں مجھے مومن کی روح قبض کرنے میں ہوتا ہے، (اس کے نہ چاہنے کے باوجود اسکو موت اس لئے دیتا ہوں کہ) اس کے سوا کوئی چارہ نہیں اور میرے مومن بندوں میں سے جب کوئی علم کا کوئی باب سیکھنا چاہتا ہے تو (بعض اوقات) میں (از راہِ شفقت) اسکو اس سے روک دیتا ہوں تاکہ علم کا وہ باب سیکھ کر اس میں غرور نہ آئے جو اسکے لئے فساد کا سبب ہو اور میرا بندہ جو کچھ میں نے اس پر فرض کیا ہے اس کی ادائیگی کے ذریعے جو میرا قرب حاصل کر سکتا ہے وہ کسی اور ذریعے سے نہیں کر سکتا۔ میرا بندہ میرے لئے مسلسل نوافل پڑھتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اسے چاہنے لگتا ہوں۔ پس جب میں اس سے محبت کر لیتا ہوں تو میں اس کے کان، آنکھ، ہاتھ اور اسکا مددگار بن جاتا ہوں۔ پھر اگر وہ مجھ سے دعا کرتا ہے تو میں (اسکی دعا) قبول کرتا ہوں اور اگر مجھ سے مانگتا ہے تو میں اسے عطا کرتا ہوں۔ پس وہ میرے لئے مخلص ہو جاتا ہے اور میں اس کیلئے مخلص ہو جاتا ہوں۔

ابن ماجہ (۲۶) حدیث مبارکہ کو نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے جب جنت

میں جائیں گے اور جنت وآخرت کے تمام انعامات وبرکات سے لطف اندوز ہو رہے ہوں گے تو پھر اللہ تعالیٰ اپنے ان نیکوں کو اپنے دیدار خاص سے نوازے گا۔"

"عن صهيب رضی اللہ عنہ(۲۷) قال: تلا رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم هذهِ الاية {للذين احسنوا الحسنى وزيادة } (يونس، ۲۶:۱۰) وقال: اذا دخل اهل الجنة الجنة واهل النار النار، نادى مناد: يا اهل الجنة، ان لكم عند الله موعدًا، يريد ان ينجز كموه، فيقولون: وما هو؟ الم يثقل الله موازيننا، ويبيض وجوهنا و يدخلنا الجنة وينجنا من النار؟ قال فيكشف الحجاب: فينظرون اليه، فوالله ما اعطاهم الله شيأً احب اليهم من النظر يعني اليه ولا اقر لاعينهم۔"(۲۸)

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آیت تلاوت فرمائی ﴿ **للذين احسنوا الحسنى وزيادة** ﴾ ایسے لوگوں کیلئے جو نیک کام کرتے ہیں نیک جزا ہے بلکہ (اس پر) اضافہ بھی ہے " اور فرمایا: جب جنتی جنت میں اور جہنمی جہنم میں داخل ہو جائیں گے تو ایک آواز دینے والا آواز دے گا: اے اہل جنت! اللہ تعالیٰ کا تم سے ایک عدہ تھا جسے وہ اب تکمیل تک پہنچا چاہتا ہے۔ اہل جنت کہیں گے: وہ کیا ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ نے ہمارے پلڑوں کو بھاری نہیں فرمایا اور کیا ہمارے چہرے منور نہیں فرمائے؟ کیا ہمیں جنت میں داخل نہیں کیا اور ہمیں دوزخ سے نجات نہیں عطا فرمائی؟ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ پردہ اٹھا دے گا اور اہل جنت اللہ تعالیٰ کا دیدار کریں گے۔ اللہ رب العزت کی قسم! اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنے دیدار سے زیادہ محبوب کوئی شے عطا نہیں کی ہوگی اور نہ اس سے زیادہ آنکھوں کی فرحت کسی شے میں ہوگی۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ اولیاء وصلحاء جب جنت میں چلے جائیں گے تو اللہ تعالیٰ انھیں رضا و خوشنودی بھی عطا فرمائے گا اور جنتیوں کو خوشخبری دی جائے گی کہ اللہ تعالیٰ ان سے کبھی بھی ناراض نہ ہوگا۔

"عن ابی سعيد الخدری رضی اللہ عنہ(۲۹) قال: قال رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان الله يقول لاهل الجنة، يا اهل الجنة! فيقولون: لبيك ربنا و سعديك، والخير فی يديك فيقول: هل رضيتم؟ فيقولون: وما لنا لا نرضى يا رب، وقد اعطيتنا ما لم تعط احدا من خلقك فيقول: الا اعطيكم افضل من ذلك فيقولون:

یارب، وای شئ افضل من ذلک ؟ فیقول : احل علیکم رضوانی؟ فلا اسخط علیکم بعدہ ابدا۔ متفق علیہ۔"(۳۰)

حضرت ابوسعید خدری سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ جنتیوں سے فرمائے گا: اے جنتیو! وہ کہیں گے ﴿لبیک و سعدیک والخیر فی یدیک﴾ اے ہمارے پروردگار! ہم تیرے حکم کے سامنے بار بار سر تسلیم خم کر کے دوہری سعادت چاہتے ہیں۔ ہر قسم کی بھلائی تمھارے اختیار میں ہے اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا تم خوش ہو؟ وہ عرض کریں گے اے رب! ہم خوش کیوں نہ ہوں تو نے ہمیں وہ کچھ عطا فرمایا ہے جو مخلوق میں کسی کو عطا نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا میں تمھیں اس سے بہتر نہ عطا کروں! وہ کہیں گے: اس سے بہتر کیا ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ فرمائے گا میں نے اپنی رضا وخوشنودی تمھیں دے دی اب میں تم پر کبھی ناراض نہیں ہوگا۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہ حضور ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اہل معرفت لوگوں کو عزت واکرام اور احترام سے جنت میں داخل کردے گا۔ حدیث نبوی:

"عن أنس بن مالک رضی الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: اذا جمع الله الأولین والاخرین ینادي مناد فیي صعید واحد من بطنان العرش: أین أهل المعرفة بالله؟ أین المحسنون؟ قال: فیقوم عنق من الناس حتی یقفوا بین یدي الله، فیقول وهو أعلم بذلک: ماأنتم؟ فیقولون: نحن أهل المعرفة الذین عرفتنا ایاک وجعلتنا أهلا لذلک۔ فیقول: صدقتم۔ ثم یقول للآخرین: ماأنتم؟ قالوا: نحن المحسنون۔ قال: صدقتم، قلت لنبی: ﴿ماعلی المحسنین من سبیل﴾ ادخلوا الجنة برحمتی، ثم تبسم رسول الله صلی الله علیه وسلم فقال: لقد نجاهم الله من اهوال بوائق القیامة۔"(۳۱)

انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اللہ جب اولین وآخرین کو جمع فرمائے گا تو ایک پکارنے والا عرش کے پایوں تلے ایک میدان سے صدا دے گا۔ کہاں ہیں اللہ تعالیٰ کی معرفت رکھنے والے؟ کہاں ہیں صاحبان احسان؟ فرمایا لوگوں میں سے ایک گروہ اللہ تعالیٰ کے سامنے جا کھڑا ہوگا۔ پس اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ حالانکہ وہ بہتر جاننے والا تم کون ہو؟ تو وہ کہیں گے ہم

اہل معرفت ہیں جنہیں تو نے اپنی معرفت عطا کی اور ہمیں اس معرفت کا اہل بنایا۔ تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ تم نے سچ کہا۔ پھر دوسرے گروہ سے پوچھے گا تم کون ہو؟ وہ عرض کریں گے ہم صاحبان احسان ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا تم نے سچ کہا میں نے اپنے نبی سے فرمایا تھا ''صاحبان احسان پر الزام کی کوئی راہ نہیں۔ لہٰذا تم پر بھی (طعنہ زنی کی) کوئی راہ نہیں۔ میری رحمت کے ساتھ سیدھے جنت میں داخل ہو جاؤ پھر حضور نبی اکرم ﷺ تبسم ریز ہوئے اور فرمایا یقیناً اللہ تعالیٰ انہیں قیامت کی ہولنا کیوں اور سختیوں سے نجات دے دے گا۔

عبادت الٰہی اور ذکر ذوالجلال کی وجہ سے اللہ تعالیٰ صوفیہ وصلحاء کو ایسی فہم وفراست سے نوازتے ہیں جس سے وہ لوگوں کے ظاہر باطن کو بھی سمجھتے ہیں۔ حدیث رسول ﷺ:

''عن أنس قال :قال رسول الله ﷺ ان لله عبادا یعرفون الناس بالتوسم۔''(۳۲)

انس رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے بعض بندے ایسے ہیں جو لوگوں (کے ظاہر و باطن) کو (اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ) فہم وفراست سے جان لیتے ہیں۔

حضور ﷺ کے مطابق صالحین سے سوال کرنا بہتر ہے۔ فرمان نبوی ﷺ:

''عن ابی الفراسي(۳۳)، ان الفراسي قال لرسول الله ﷺ: أسأل یارسول الله، قال: لا وان کنت سائلا لا بد فاسأل الصالحین۔''(۳۴)

حضرت ابن فراسی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ (ان کے والد) حضرت فراسی رضی اللہ عنہ نے حضور نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا: یارسول اللہ! کیا میں لوگوں سے سوال کر سکتا ہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، اور اگر سوال کرنا انتہائی ضروری ہو تو تم (صرف) صالحین سے سوال کرو (کیونکہ صرف وہی مدد کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں۔

حضور ﷺ ایک مرتبہ فرمایا کتاب وسنت سے رہنمائی نہ ملنے کی صورت میں عابدوں اور مومنوں کو غور وفکر کرنا چاہیے۔ فرمان نبوی ﷺ ہے:

''عن أبي سلمة(۳۵): أن النبي ﷺ سئل عن الأمر یحدث لیس في کتاب ولا سنة فقال: ینظر فیه العابدون من المؤمنین۔''(۳۶)

حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ سے اس معاملہ کے بارے میں

پوچھا گیا جو پیش آئے اور اس کے بارے میں کتاب وسنت میں کوئی واضح راہنمائی نہ ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اس معاملہ میں عبادت گزار مومن (یعنی اولیاء وصالحین) غور وفکر کریں (اور اس کا حل بتائیں۔

علامہ عبدالرزاق (۳۷) اپنی کتاب ''المصنف'' میں ایک حدیث مبارک کو نقل کرتے ہیں۔ جس میں آنحضور ﷺ نے صالحین کے فیصلہ اور سوچ کو قوی قرار دیا۔ حدیث نبوی ﷺ:

''عن القاسم بن عبد الرحمن (۳۸) أن ابن مسعود (۳۹) قال: اذا حضرک أمر لا تجد منه بدا فاقض بما في كتاب الله فان عييت فاقض بسنة نبي الله، فان عييت فاقض بما قضى به الصالحون، فان عييت فأومىء ايماء ولا تأل فان عييت فافر منه ولا تستحي۔'' (۴۰)

حضرت قاسم بن عبدالرحمن بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر تمہیں کوئی ایسا معاملہ درپیش ہو جس سے فرار ممکن نہ ہو تو اس بارے میں اللہ تعالیٰ کی کتاب کے مطابق فیصلہ کرو اور اگر تم ایسا کرنے سے عاجز آ جاؤ تو پھر حضور نبی اکرم ﷺ کی سنت کے مطابق فیصلہ کرو اور اگر تم اس کے مطابق بھی فیصلہ کرنے سے عاجز آ جاؤ تو صالحین کے فیصلہ کے مطابق فیصلہ کرو اور اگر تم اس سے بھی عاجز آ جاؤ تو پھر اپنی رائے کا اظہار کرو اور ٹال مٹول نہ کرو اور اگر تم اس سے بھی عاجز آ جاؤ تو اس معاملہ سے انکار کر دو اور اس سے شرم محسوس نہ کرو۔

اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے سے انسان اللہ تعالیٰ کا محبوب اور پسندیدہ بندہ بن جاتا ہے بلکہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جب کوئی مومن اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسکے ساتھ ہو جاتا ہے اگر وہ اللہ کا ذکر اکیلے کرے تو اللہ تعالیٰ اسکا ذکر اکیلے کرتا ہے اگر انسان اسکا ذکر جماعت میں کرے تو اللہ تعالیٰ اسکا ذکر جماعت میں کرتا ہے۔ فرمان نبوی ﷺ:

''عن أبي هريرة رضى الله عنه قال: قال النبي ﷺ: يقول الله تعالىٰ: أنا عند ظن عبدي بي وأنا معه اذا ذكرني فان ذكرني في نفسه ذكرته في نفسي، وان ذكرني في ملاء ذكرته في ملاء خير منهم، وان تقرب الي شبرا تقربت اليه ذراعا، وان تقرب الي ذراعا تقربت اليه باعاوان أتاني يمشي أتيته

هرولة۔"(۴۱)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میرا بندہ میرے متعلق جیسا خیال رکھتا ہے میں اس کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرتا ہوں۔ جب وہ میرا ذکر کرتا ہے میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔ اگر وہ اپنے دل میں میرا ذکر (یعنی ذکرِ خفی) کرے تو میں بھی اپنے (شایانِ شان) اکیلے اس کا ذکر کرتا ہوں، اور اگر وہ جماعت میں میرا ذکر (یعنی ذکرِ جہری) کرے تو میں اس کی جماعت سے میں اس کا ذکر کرتا ہوں۔ اگر وہ ایک بالشت میرے نزدیک آئے تو میں ایک بازو کے برابر اس کے نزدیک ہو جاتا ہوں۔ اگر وہ ایک بازو کے برابر میرے نزدیک آئے تو میں دو بازوؤں کے برابر اس کے نزدیک ہو جاتا ہوں اور اگر وہ میری طرف چل کر آئے تو میں اس کی طرف دوڑ کر جاتا ہوں۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ذکرووِرد کی اہمیت بیان کرتے ہوئے فرما دیا کہ ذکر نہ کرنے والا تو مردہ ہے۔ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم:

"عن أبي موسى رضى الله عنه(۴۲) قال: قال النبي صلى الله عليه وآله وسلم: مثل الذي يذكر ربه والذي لا يذكر ربه مثل الحي والميت۔"(۴۳)

حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اپنے رب کا ذکر کرنے والے اور نہ کرنے والے شخص کی مثال زندہ اور مردہ کی سی ہے۔

دوسری جگہ پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب بھی لوگ ذکر کے لیے بیٹھتے ہیں تو فرشتے انہیں ڈھانپ لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی رحمت انکو اپنی آغوش میں لے لیتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"عن أبي هريرة وأبي سعيد الخدري رضى الله عنهما: أنهما شهدا على النبي صلى الله عليه وآله وسلم أنه قال: لا يقعد قوم يذكرون الله الا حفتهم الملائكة وغشيتهم الرحمة، ونزلت عليهم السكينة، وذكرهم الله فيمن عنده۔"(۴۴)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ دونوں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں گواہی دی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب بھی لوگ اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لیے بیٹھتے ہیں تو فرشتے انہیں ڈھانپ لیتے ہیں اور رحمت الٰہی انہیں اپنی آغوش میں لے لیتی ہے اور ان پر سکینہ کا نزول ہوتا ہے اللہ تعالیٰ ان کا ذکر اپنی بارگاہ کے حاضرین میں کرتا ہے۔

صوفیہ وصلحاء کا وظیفہ اور ورد فقط اللہ تعالیٰ کا ذکر ہی ہوتا ہے۔ اور وہ اپنے پاس آنے والے لوگوں کو بھی اسی کی تبلیغ کرتے ہیں۔ کیونکہ ذکر اللہ بہت فضیلت کا باعث ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے ذاکرین مرد اور عورت کو افضل قرار دیا۔

"عن أبي سعيد الخدری رضی اللہ عنہ: أن رسول اللہ ﷺ سئل: أي العباد أفضل درجة عند اللہ یوم القیامة؟ قال: الذاکرون اللہ کثیرا والذاکرات۔ قلت: یارسول اللہ، ومن الغازي في سبیل اللہ؟ قال: لو ضرب بسیفه في الکفار والمشرکین حتی ینکسر، ویختضب دما لکان الذکرون اللہ أفضل منه درجة۔"(۴۵)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ سے پوچھا گیا: کون سے لوگ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے ہاں درجہ میں افضل ہوں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے مرد اور کثرت سے ذکر کرنے والی عورتیں۔ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والے سے بھی (زیادہ)؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اگر کوئی شخص اپنی تلوار کافروں اور مشرکوں پر اس قدر چلائے کہ وہ ٹوٹ جائے اور خون آلود ہوجائے پھر بھی اللہ کا ذکر کرنے والے اس سے ایک درجہ افضل ہیں۔

دوسری جگہ پر آپ ﷺ نے اس طرح فرمایا:

"عن انس قال: قال رسول اللہ ﷺ یقول اللہ عزوجل اخرجوا من النار من ذکرنی یوما او خافنی فی مقام۔"(۴۶)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا (روز قیامت) اللہ تعالیٰ فرمائے گا دوزخ میں سے ایسے شخص کو نکال دو جس نے ایک دن بھی مجھے یاد کیا یا کسی مقام پر (بھی) مجھ سے ڈرا۔

اللہ تعالیٰ کے نیک بندے گوشہ نشین ہوکر عبادت الٰہی اور تقویٰ کی زندگی اختیار کرتے ہیں اور اسی خوبی کی وجہ سے ہے وہ اللہ تعالیٰ کے محبوب ہوتے ہیں۔ فرمان نبوی ﷺ:

"عن سعد بن ابی وقاص (۴۷) قال: سمعت رسول اللہ یقول: ان اللہ یحب

العبد التقي الغني الخفي۔‘‘(۴۸)

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے حضور نبی اکرم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اپنے اس بندے سے محبت رکھتا ہے جو متقی، مستغنی ہو اور گوشہ نشین ہو۔

حدیث پاک میں آتا ہے کہ اولیاء کی یہ بھی خوبی ہے کہ وہ لوگوں سے پوشیدہ ہوں تو انہیں تلاش نہیں کیا جاتا ہے اور انکے دل اندھیرے میں چراغ کی مانند ہوتے ہیں۔فرمان رسول ﷺ:

’’عن زيد بن أسلم رضى الله عنه(۴۹)**عن أبيه: أن عمر رضى الله عنه خرج الى المسجد يوما فوجد معاذا عند قبر رسول الله ﷺ يبكي، فقال: ما يبكيک يامعاذ؟قال: يبكيني حديث سمعته من رسول الله ﷺ يقول: اليسير من الرياء شرک، ومن عادى أولياء الله فقد بارز الله بالمحاربة، ان الله يحب الأبرار الأتقياء الأخفياء الذين ان غابوا لم يفتقدوا، وان حضروا لم يعرفوا، قلوبهم مصابيح الدجى يخرجون من كل غبراء مظلمة۔‘‘**(۵۰)

حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ایک دن مسجد نبوی میں حاضر ہوئے تو معاذ رضی اللہ عنہ کو حضور نبی اکرم ﷺ کی قبر انور کے قریب روتے ہوئے پایا، آپ رضی اللہ عنہ نے پوچھا: اے معاذ! تجھے کس چیز نے رلا دیا ہے؟ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: مجھے اس حدیث نے رُلا دیا ہے جو میں نے حضور نبی اکرم ﷺ سے سنی۔آپ ﷺ نے فرمایا: معمولی سی ریا کاری بھی شرک ہے اور جس نے اولیاء اللہ سے دشمنی مول لی تو اس نے اللہ تعالیٰ سے جنگ مول لی اور بے شک اللہ تعالیٰ نیکوکار، متقی، متواضع اور لوگوں سے پوشیدہ ایسے گمنام بندوں کو پسند کرتا ہے جو اگر موجود نہ ہوں تو انہیں تلاش نہ کیا جائے اور اگر موجود ہوں تو انہیں پہچانا نہ جائے (یعنی کوئی اہمیت نہ دی جائے)۔ان کے دل اندھیرے میں چراغ کی مانند ہیں اور وہ ہر ایک طرح کی ظلمت وتاریکی سے پاک ہوتے ہیں۔

اولیاء اللہ، اللہ تعالیٰ کے احکامات کی پابندی کے ساتھ ساتھ اطاعتِ رسول ﷺ کو بھی اپنی زندگی کا حصہ بنا لیتے ہیں اور غلامی رسول ﷺ میں رہ کر اپنی روحانی منازل کو طے کرتے ہیں۔آنحضور ﷺ کی غلامی میں رہے اور دعویٰ کرنے والے اللہ تعالیٰ کے محبوب بندے بن جاتے ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق بھی ان

سے پیار کرتی ہے۔

"عن سفینة رضی الله عنه(۵۱) قال: رکبت البحر في السفینة فانکسرت فرکبت لوحا منها فطرحني في أجمة فیها أسد فلم یرعني الا به فقلت: یا أبا الحارث، أنا مولی رسول الله ﷺ فطأطأ رأسه وغمز بمنکبه شقي فما زال یغمزني ویهدیني الی الطریق حتی وضعني علی الطریق فلما وضعني همهم فظننت أنه یودعني۔"(۵۲)

حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ (ایک مرتبہ) میں سمندر میں ایک کشتی پر سوار تھا کہ وہ کشتی ٹوٹ گئی تو میں اس کے ایک تختے پر سوار ہو گیا۔ اس نے مجھے ایک ایسی جگہ پھینک دیا جو شیر کی کچھار تھی (وہی ہوا جس کا ڈر تھا) اور اچانک شیر سامنے تھا۔ میں نے کہا: اے شیر! میں رسول اللہ ﷺ کا غلام ہوں تو اس نے فوراً اپنا سر خم کر دیا اور اپنے کندھے سے مجھے اشارہ کیا اور وہ اس وقت تک مجھے اشارہ اور رہنمائی کرتا رہا جب تک کہ اس نے مجھے صحیح راہ پر نہ ڈال دیا۔ پھر جب اس نے مجھے صحیح پر ڈال دیا تو وہ دھیمی آواز میں غرغرایا تو میں نے خیال کیا کہ وہ مجھے الوداع کہہ رہا ہے۔

اہلِ علم، تصوف کی تاریخ اور اہمیت کو بیان کرتے ہوئے اصحاب صفہ کے مجاہدہ، تقویٰ، زہد اور عبادت گزاری کا تذکرہ ضرور کرتے ہیں۔ ان لوگوں کا واقعی تاریخ تصوف میں بہت مقام ہے اور آپ ﷺ کی ایک حدیث پاک سے بھی یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ وہ شخصیات صاحبِ کرامت بھی تھیں۔ حدیث نبوی ﷺ:

"عن أنس رضی الله عنه قال: کنا في الصفة عند رسول الله ﷺ فأتته امرأة مهاجرة ومعها ابن لها قد بلغ، فأضاف المرأة الی النساء، وأضاف ابنها الینا فلم یلبث أن أصابه وباء المدینة، فمرض أیاما ثم قبض، فغمضه النبي ﷺ وأمر بجهازه، فلما أردنا أن نغسله، قال: یا أنس، ائت أمه، فاعلمتها، فجاءت حتی جلست عند قدمیه فأخذت بهما، رغبة، اللهم، لا تشمت بي عبدة الأوثان، ولا تحملني من هذه المصیبة مالا طاقة لي بحملها، قال: فوالله ماتقضي کلامها حتی حرک قدمیه، وألقی الثوب عن وجهه، وعاش حتی

قبض اللہ رسولہ ﷺ، وحتی ھلکت أمہ۔''(۵۳)

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم حضور نبی اکرم ﷺ کے پاس صفہ میں تھے کہ ایک عورت ہجرت کر کے حضور نبی اکرم ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئی، اس کے ساتھ اس کا بیٹا بھی تھا جو حدِ بلوغ کو پہنچا ہوا تھا۔ پس آپ ﷺ نے عورت کو عورتوں کے ساتھ ملا دیا اور اس کے بیٹے کو ہمارے ساتھ ملا دیا پس جلد ہی وہ مدینہ کی وبا میں مبتلا ہو گیا، اور چند دن بیمار رہنے کے بعد اللہ تعالیٰ کو پیارا ہو گیا۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے اس کی آنکھیں بند کر دیں، اور اس کی تجہیز و تکفین کا حکم فرمایا۔ سو جب ہم نے اسے غسل دینے کا ارادہ کیا تو حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اے انس! اس کی ماں کے پاس جاؤ (اور اسے اس کی موت کی خبر دو)۔ لہٰذا میں نے (جا کر) اسے اس کے بیٹے کی وفات کا بتایا۔ وہ آئی اور آ کر اس کے قدموں کے قریب بیٹھ گئی اور انہیں پکڑ لیا، اور یہ دعا کی: اے اللہ! میری اس مصیبت کی وجہ سے بتوں کے بجاریوں کو خوش نہ کر اور نہ ہی مجھے اس مصیبت سے دو چار کر جس کی میں ہمت نہیں رکھتی۔ راوی بیان کرتے ہیں: خدا کی قسم! اس نے ابھی اپنا کلام ختم نہیں کیا تھا کہ اس لڑکے نے اپنے قدموں کو حرکت دی اور اپنے چہرے سے کپڑا ہٹا دیا پھر وہ حضور نبی اکرم ﷺ کے وصال مبارک اور اپنی ماں کی وفات کے بعد تک زندہ رہا۔

حضور ﷺ نے سے زیادہ قابل رشک دوست اسکو قرار دیا جو عبادت گزار ہو خاموشی اور پوشیدگی سے اطاعت شعار ہو۔ اور یہی اولیاء اللہ کے فضائل میں حضور ﷺ نے فرمایا:

''عن أبي أمامة رضی اللہ عنہ (۵۴) عن النبی ﷺ قال: ان أغبط أولیائي عندي لمؤمن خفیف الحاذ ذو حظ من الصلاة أحسن عبادة ربه وأطاعه في السر وکان غامضا في الناس لایشار الیه بالأصابع وکان رزقه کفافا فصبر علی ذلک ثم نقر بیده فقال: عجلت منیته قلت بواکیه قل تراثه۔''(۵۵)

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: میرے نزدیک سب سے زیادہ قابل رشک دوست وہ مومن ہے جو قلتِ مال (کی وجہ سے) ہلکے بوجھ والا ہو، نماز سے لطف لینے والا، اپنے رب کا بہترین عبادت گزار ہو، خاموشی اور پوشیدگی کے ساتھ اپنے رب کی اطاعت کرتا ہو۔ لوگوں سے مخفی ہو، اس کی طرف انگلیاں نہ اٹھتی ہوں، حسبِ ضرورت روزی میسر ہو اور اس پر وہ صابر ہو۔ پھر آپ ﷺ نے اپنی

انگلیوں کو زمین پر مارتے ہوئے فرمایا: اس کی موت قریب آ چکی ہے۔ اس پر رونے والی عورتیں کم ہوں گی اور اس کا ترکہ بھی قلیل ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کے نیک بندے وہ ہیں جن کو دیکھ کر اللہ یاد آ جاتا ہے۔ فرمان نبوی ﷺ ہے:

"عن الحسن قال: قال رسول اللہ ﷺ ان للہ عبادا إذا رؤوا ذکر اللہ۔"(۵۶)

حضرت حسن بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا بے شک اللہ کے بعض بندے ایسے ہیں جنہیں دیکھ کر اللہ یاد آ جاتا ہے۔

مذکورہ بالا آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ ﷺ کی روشنی میں تصوف کی ضرورت اہمیت اجاگر ہو جاتی ہے۔ کہ تصوف اصل میں تزکیہ نفس، روحانی تربیت جسمانی طہارت، زہد وتقویٰ، عبادت وریاضت کا بہترین ذریعہ ہے تصوف کی تعلیمات سے انسان راہ مستقیم اختیار کر لیتا ہے۔

○○○

حوالہ جات

۱۔ الذّٰریت ۱:۶

۲۔ البقرہ ۲:۱

۳۔ الانفال ۸:۴

۴۔ البقرہ ۲:۴

۵۔ توبہ ۹:۷

۶۔ الانفال ۸:۲

۷۔ الاعلیٰ:۴۷

۸۔ البقرہ ۲:۲

۹۔ النور ۴:۷

۱۰۔ فاروقی، ضیاءالحسن، پروفیسر، آئینہ تصوف، لاہور: تصوف فاؤنڈیشن، ۱۴۲۰ھ/۱۹۹۹ء، ص ۲۱۔۲۲

۱۱۔ المجادلۃ ۸:۹

۱۲۔ المجادلۃ:۸

۱۳۔ النساء ۴:۹

۱۴۔ یونس:۲

۱۵۔ الجمعۃ ۲:۲

۱۶۔ المائدہ ۵:۳

۱۷۔ آل عمران ۳:۱۹

۱۸۔ الطلاق:۳

۱۹۔ الفتح:۸

۲۰۔ الرعد:۸

۲۱۔ الانبیاء ۱:۷

۲۲۔ ابوھریرہؓ: عبدالرحمن بن عامر کنیت ابوھریرہ۔ آپ کا ایک نام عبداللہ بن صخر بھی آتا ہے صلح حدیبیہ (۶ ھ) اور غزوۂ خیبر (۷ ھ) کے درمیان اسلام قبول کیا۔ سب سے زیادہ احادیث آپ سے مروی ہیں۔ ۵۷ ھ وفات
ملاحظہ ہو الطبقات الکبری، ج ۲ ص ۳۶۲، الاصابہ، ج ۱۲ ص ۶۳، اسد الغابہ، ج ۶ ص ۳۱۳

۲۳۔ بخاری، ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری، بیروت لبنان: دارالقلم، ۱۴۰۱ھ، ج ۵ ص ۲۳۸۴

۲۴۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ: صحابی رسولؐ، انصاری، خادم رسول، بصرہ میں وفات ۹۲ ھ
ملاحظہ ہو ابن سعد، ابی عبداللہ محمد بن سعد، الطبقات الکبریٰ، بیروت لبنان: دارصادر، ۱۹۶۸ء، ج ۷ ص ۱۷

۲۵۔ قضاعی، ابوعبداللہ محمد بن سلامہ بن جعفر، مسند الشھاب، بیروت لبنان: مؤسسۃ الرسالہ، ج ۲ ص ۲۲۷

۲۶۔ ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ: نام ابوعبداللہ محمد بن یزید ابن ماجہ القزوینی ہے۔ آپ ۲۰۹ ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ حدیث مبارکہ کی کتاب ''سنن ابن ماجہ'' کے مؤلف ہیں۔ وفات ۲۷۳ ھ ہوئی۔
ملاحظہ ہو، یاقوت حموی، شہاب الدین یاقوت بن عبداللہ، المعجم مکتبۃ الرشد، ریاض ص ۷، طبع الاول ۱۴۱۱ھ، سنن ابن ماجہ، ج ۱ ص ۵

۲۷۔ حضرت صھیبؓ: نام صھیب بن سنان بن مالک آپ کا تعلق روم سے ہے۔ اس لیے رومی کہلائے۔ آپ کو یہ بھی سعادت نصیب ہوئی کہ غزوہ بدر میں بھی شریک ہوئے۔ اس لیے بدری کہلائے آپ رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ میں ۳۸ ھ کو فوت ہوئے۔
ملاحظہ ہو۔ الاستیعاب، ج ۵۷ ۱۴، الاصابۃ، ج ۵ ص ۱۹۰، اسد الغابۃ، ج ۳ ص ۳۸

۲۸۔ ابن ماجہ، ابوعبداللہ محمد بن یزید قزوینی، السنن، بیروت لبنان: دارالکتب العلمیہ، ۱۴۱۹ھ، ص ۱، ج ۶۸

۲۹۔ ابی سعید خدریؓ: نام سعد بن مالک بن سنان۔ اپنے جد امجد خدرۃ بن عوف کی نسبت سے خدری کہلائے انصاری، حافظ، کثیر الحدیث کے راوی ہیں، فقہاء صحابہ میں شمار، وفات ۷۴ ھ
ملاحظہ ہو ذھبی شمس الدین محمد بن علی بن احمد، سیر اعلام النبلاء، بیروت لبنان: مؤسسۃ الرسالۃ، طبع اول، ۱۴۰۱ھ، ج ۳ ص ۱۶۸،

۳۰۔ مسلم، ابن الحجاج قشیری: الصحیح، بیروت لبنان: داراحیاء التراث العربی، س ن، ج ۲ ص ۲۱۷۶

۳۱۔ ابونعیم، احمد بن عبداللہ بن احمد بن اسحاق، کتاب الاربعین علی مذھب المحققین من الصوفیۃ، بیروت لبنان: دار ابن حزم، ۱۹۹۳ء، ج ۱ ص ۱۰۰

۳۲۔ دیلمی، ابوشجاع شیرویہ بن شہردار ین شیرویہ بن فناخسرو، مسند الفردوس، بیروت لبنان: دارالکتب العلمیہ، ۱۹۸۶ء، ج ۱ ص ۱۸۳،

۳۳۔ ابن الفراسی: یہ صحابی رسول حضرت فراسی رضی اللہ عنہ کے بیٹے ہیں۔ حضرت فراسی رضی اللہ عنہ سے کئی احادیث مروی ہیں۔

۳۴۔ ابوداؤد، سلیمان بن اشعث سجستانی، السنن، بیروت لبنان: دارالفکر، ۱۹۹۴ء، ج ۲، ص ۱۲۲

۳۵۔ حضرت ابی سلمہؓ: نام عبداللہ بن عبدالاسد بن مغیرہ۔ حضورؐ کے رضاعی بھائی۔ قدیم الاسلام، حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ وفات ۵۵ھ

ملاحظہ ہو، ابن ھشام، ابومحمد عبدالملک بن ھشام، سیرۃ النبویۃ، قاہرہ مصر: مطبعۃ مصطفی البانی، ۱۳۵۵ھ، ص ۵۔۱۴

۳۶۔ دارمی، ابومحمد عبداللہ عبدالرحمن، السنن، بیروت لبنان: دارالکتاب العربی، ۱۴۰۷ھ، ج ۱، ص ۶۱

۳۷۔ عبدالرزاق: نام عبدالرزاق، ابوبکر بن ہمام، آپ کا تعلق صنعان سے ہے اس لیے صنعائی کہلائے آپ نے احادیث شعبہ میں بہت کام کیا آپ نے شعبہ حدیث میں کتاب ''المصنف'' کے مصنف بھی ہیں۔ وفات ۲۱۱ھ صنعان میں دفن، ملاحظہ ہو، المصنف، ص ۱۲

۳۸۔ حضرت القاسم بن عبدالرحمن: نام القاسم بن عبدالرحمان بن قاسم آپ مصر میں پیدا ہوئے کبار شخصیات میں آپ کا نام شامل ہے۔ ملاحظہ ہو محمصانی، فلسفہ شریعت اسلام، ص ۶۱

۳۹۔ حضرت ابن مسعود: نام عبداللہ بن مسعود بن غافل،، بدری ہیں، آپ ابن ام عبد کے نام سے مشہور ہیں۔ حضرت عمرؓ نے آپ کو قاضی مقرر کیا۔ وفات ۳۶ھ

ملاحظہ ہو تذکرۃ الحفاظ، ج ۱، ص ۱۳۱، الاستیعاب، ج ۷، ص ۲۰، الاصابۃ، ج ۶، ص ۲۱۴

۴۰۔ عبدالرزاق، ابوبکر بن ہمام بن نافع صنعانی، المصنف، بیروت لبنان: المکتب الاسلامی، ۱۴۰۳ھ، ج ۸، ص ۳۰۱

۴۱۔ بخاری، صحیح بخاری، ج ۶، ص ۲۶۹۴

۴۲۔ حضرت ابوموسیٰ: نام عبداللہ بن قیس ہے۔ آپ قدیم الاسلام تھے حضرت عمرؓ نے آپ کو بصرہ کا حاکم بنایا مکہ میں آپ کا انتقال ہوا۔ سال وفات ۵۰ھ، ملاحظہ ہو الطبقات الکبریٰ ۲/۳۴۴

۴۳۔ بیہقی، ابوبکر بن احمد بن حسین، شعب الایمان، بیروت لبنان: دارالکتب العلمیہ، ۱۴۱۰ھ، ج ۱، ص ۴۰۱

۴۴۔ ابویعلی، احمد بن علی بن مثنی بن یحییٰ، المسند، دمشق شام: دارالمامون للتراث، ۱۴۰۴ھ، ج ۱۱، ص ۲۰

۴۵۔ ترمذی، ج ۵، ص ۴۵۸

۴۶۔ طبرانی، مسند الشامیین، بیروت لبنان: موسسۃ الرسالہ، ۱۴۰۵ھ، ج ۲، ص ۳۸۴

۴۷۔ سعد بن ابی وقاص: مشہور صحابی، عشرہ مبشرہ، سترہ برس کی عمر میں اسلام قبول کیا فاتح ایران، کوفہ شہر آپؓ نے آباد کیا وفات ۶۷۱ھ

ابن حجر عسقلانی، شہاب الدین ابوالفضل احمد بن علی، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ، مصر: مکتبۃ الکلیات الزھریہ، س

ن، ص ۷۸۷

۴۸۔ صحیح مسلم، ج ۴، ص ۲۲۷۷، احمد بن حنبل، المسند، ج ۱۔ ص ۱۶۸

۴۹۔ زید بن اسلم: اصحاب حدیث میں سے جید شخصیت ہیں اور ان کا مرکز مدینہ تھا۔ آپ کے قضایا فتاوی بھی بڑے اہم تھے۔ ملاحظہ ہو۔ الطبقات الکبریٰ ۳/۱۵۰، تذکرۃ الحفاظ ۱/۱۳، الاصابۃ ۶/۲۱۴

۵۰۔ قضاعی، مسند الشھاب، ج ۲، ص ۲۵۲

۵۱۔ حضرت سفینہؓ: آپ کے نام کے بارے کئی اقوال ہیں۔ مثلاً مروان، نجران، مہران، رومان، لجھمان، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ کو سفینہ کہا ایک دفعہ سفر میں جو تھک جاتا آپ کو سامان پکڑا دیتا۔ آپ کے پاس بہت سا سامان آ گیا آپؐ نے فرمایا ''انت سفینۃ'' ملاحظہ ہو۔ تاریخ الصحابۃ ص ۱۲۶، اسد الغابۃ ۲/۵۰۳

۵۲۔ بخاری، التاریخ الکبیر، مصر: دار الکتب العلمیہ، س ن، ۲ ۳، ص ۱۹۵

۵۳۔ بیہقی، دلائل النبوۃ، بیروت لبنان: دار الکتب العلمیہ، ۱۹۸۵ء، ج ۶، ص ۵۲

۵۴۔ ابوامامہ رحمۃ اللہ علیہ: نام اسعد بن سہل بن حنیف انصاری کنیت ابوامامہ جس سے آپ مشہور تھے مدینہ کے کبار تابعین میں سے تے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے دو سال قبل پیدا ہوئے۔ وفات ۱۰۰ھ۔ ملاحظہ ہو اسد الغابۃ ۶/۱۶، الاستیعاب، ۱۱/۱۵۷

۵۵۔ ترمذی، ج ۴، ص ۵۷۵، حمیدی، ابوبکر عبداللہ بن زبیر، قاہرہ مصر: المسند، س ن، ج ۲، ص ۴۰۴

۵۶۔ ابن ابی دنیا، ابوبکر عبداللہ بن محمد القرشی، الاولیاء، بیروت لبنان: مؤسسۃ الکتب الثقافیہ، ۱۴۱۳ھ، ج ۱، ص ۳۹

ooo

سماجی رویوں کی تشکیل میں صوفیہ کا کردار

ڈاکٹر عمرانہ شہزادی ☆

Abstract:

This article provides a description about the role of sufis which they perform in any and Era to build social behaviours and manners of individuals in society. They seek complete guidance from Holy Quran and the Seerah of Holy Prophet (S.A.W.W) to educate the mankind for having self purification. Their Primary focus is to eliminate greed egotism and other evils and clean the heart from pride. They teach that a man of good behaviour and character is who fulfill all duties which are assign them by Allah.They preach Islam and encourge the society to gain spiritual pleasures and to face difficulties and pain with patience.

Key words:

Sufis, Behaviour, Eliminate, Sufism, Society, Spiritual, Pleasures, Pain, Patience, Encourage.

سماج سنسکرت زبان کا لفظ ہے اور بطورِ اسم مستعمل ہے گروہ، سوسائٹی (معاشرہ)، بزم، انجمن، محفل اور مجلس اس کے مترادفات ہیں۔

Cooling Wood ماہرِ سماجیات نے کہا، سماج جمعیت کی وہ قسم یا حصہ ہے جس کے افراد اپنے

☆ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ عربی، گورنمنٹ کالج برائے خواتین یونیورسٹی، فیصل آباد

طرزِ زندگی کا شعور رکھتے ہیں، رویہ وہ مشترکہ مقاصد اوراَقدار ہیں جن کے ذریعے وہ مربوط ہوتے ہیں۔(۱)

ماہرِ سماجیات ایک سائنسدان کی حیثیت سے یہ تو بتا سکتا ہے کہ اس کے نزدیک کسی مخصوص سماج کے مقاصد واقدار کیا ہیں لیکن مذہب وتصوف کی حدود میں داخل ہوئے بغیر وہ یہ نہیں بتا سکتا کہ ان اقدار ومقاصد کا حصول کیسے ممکن ہے گویا مرض کی تشخیص ہوگئی لیکن علاج شروع نہ ہو سکا۔ ماہرینِ نفسیات اس بات پر متفق ہیں کہ تعمیرِ شخصیت ہی سماجی رویوں کی تشکیل کا سبب بنتی ہے، گوئٹے کے الفاظ ہیں ''ہر شخص کا آخری مقصد اور قوی ترین خواہش انسانی وجود یا شخصیت کی پوری تکمیل ہے''(۲)

شخصیت، بندے کا اللہ کے ساتھ تعلق، کردار، اعتقادات اور حسین اعمال سے معرض وجود میں آتی ہے اور سچی شخصیت ہمیشہ اپنے اندر ایک پیغام رکھتی ہے اور اپنے پیغام میں اس کا ایمان ہوتا ہے یہ روح فطری طور پر اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے تعلق سے آشنا ہے اور اس کے قرب کی جویا ہے کیونکہ عالم ارواح میں ''اَلَستُ بربّکم'' کا جواب اِثبات میں دے کر آئی ہے اللہ تعالیٰ کی محبت اس کا محور ہے اس لیے ہر قلب میں اللہ تعالیٰ کے وجود کا احساس اور اس کی طرف بڑھنے کی اُمنگ موجود ہے۔ اسی کی یاددہانی کے لیے پیامبر تشریف لائے اور اسی تعلق کو آنحضور ﷺ نے نکھری ہوئی صورت میں پیش کیا۔ آپ ﷺ کی تعلیمات پر ایمان لانے والے اور عمل کرنے والے صاحبِ ایمان کہلائے تو ان کے نام تاریخ کے حافظے سے محو نہ ہو پائے یہی لوگ انسانیت کے گلِ سرسبز بنے وہ بیج جن سے نئے نئے گلشن کھلتے رہے۔

دورِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد جب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ بندوں کے تعلق کا آئینہ دھندلانے لگا جس کے نتیجے میں تعصّبات مذہبی فرقہ پرستی، ریاکاری ظاہرداری جیسے ناسور سماج میں پنپنے لگے تو نبضِ ہستی ڈگمگانے لگی تب اس گھٹاٹوپ اندھیرے میں مثلِ شمع روشن کچھ نفوس قدسیہ نے توحید پر پختہ یقین، شریعتِ محمدی پر ایمان، خلوصِ دل سے تقویٰ رواداری، انسان دوستی، نفسانی خواہشات سے اپنا ہاتھ کھینچنے، تزکیہ نفس کے منصب کی پاسداری کو اپنا مشن بنایا اور روحِ اسلام کی حیاتِ نو کی، ان کے اس عمل کو اصطلاح میں تصوف کے نام سے پکارا گیا (اور فحول صوفیہ کے ہاں تصوف تزکیۂ نفس اور تصفیۂ اخلاق کا نام ہے)(۳) اس رویہ کو اختیار کرنے والے ولی بن گئے۔ ان کے آستانے امن کے ٹھکانے بنے، دل کی اُجڑی بستیاں ذکرِ الٰہی سے آباد ہوئیں ان کے ہاتھ ہمیشہ دعا کے لیے اُٹھے آج دنیا ان کی عظمتوں کو سلام کرتی ہے۔

تصوف کے ناقدین دلیل دیتے ہیں کہ صدرِ اسلام میں لفظ تصوف تو مستعمل نہ تھا، تصوف کے خلاف فتویٰ بازی آج کی بات نہیں انانیت پسندوں کا وطیرہ شروع ہی سے ایسا اور اپنی فکر کو ملت کی فکر پر ترجیح دینے

والے کا رویہ ہمیشہ ناقدانہ اور معاندانہ ہی ہوتا ہے۔

تصوف کے وجود سے انکار ممکن نہیں، صوفیہ کے بارے میں ایسا رویہ اختیار کرنے والوں نے ان کی حالاتِ زندگی، زہد، ورع وتقویٰ، شریعت کی پاسداری سے ان کے کردار کا مطالعہ کرنے کی زحمت گوارا نہ کی اور تعصب کا شکار ہو کر تصوف کو شریعت کا بدل قرار دے دیا اور بددیانتی کے مرتکب ہوئے ایسا لگتا ہے کہ وہ آخرت میں جوابدہی سے غافل ہیں۔

توحید پر پختہ ایمان، شریعتِ محمدی پر خلوصِ دل سے عمل پیرا ہونا، خلقِ خدا سے شفقت اور خدمتِ خلق حقیقتِ اسلام کی روح پیش کرتے ہیں اور یہی اسلامی تصوف کی خوبیاں ہیں ان پر عمل پیرا ہونا قطعاً بدعت کے زمرے میں نہیں آتا گویا تصوف کوئی درآمد شدہ جنس وعمل نہیں یہ خالصتاً اسلامی تعلیمات سے ترتیب پایا ہوا طریقۂ عبادت ہے آپ ﷺ کے دور میں ایک عام مسلمان کی زندگی روحِ اسلام کی اس قدر عکاس تھی کہ تعارف وشناخت کے لیے صوفی کی اصطلاح کا مستعمل ہونا ضروری نہ تھا صحابہ کرام مفسر ومحدث ہونے کے باوجود صحابی کہلانا اپنے لیے اعزاز سمجھتے تھے حالانکہ وہ خود ہی تو صوفی تحریک کے بانی تھے۔ تعارف وشناخت کے لیے القابات ہمیشہ حالات وضرورت کے حوالے سے رواج پاتے ہیں اور ان سے ایسے لوگوں کو نوازا جاتا ہے جنہیں عوام کے مقابلے میں امتیاز حاصل ہو۔ بطورِ طبیب حاذق شریعت کی پاسداری کرتے ہوئے دورِ صحابہ کے بعد سماج کی تطہیر کے لیے جن اللہ کے بندوں نے سماج میں پنپتے ہوئے ناسور کا علاج کیا تو ان نفوس قدسیہ کے تعارف وشناخت کے لیے لفظ ''صوفی'' کے سابقے ولاحقے اختیار کیے گئے جو کوئی غیر اسلامی اقدام نہ تھا۔ اس نام نے انہیں عوام الناس سے ممتاز کیا۔ کیونکہ انہوں نے اس آلائشوں سے بھرپور معاشرے میں انسانیت کو توحید، وحدتِ انسانی، صداقت شعاری کی اہمیت سے روشناس کیا تھا۔ ایسی ایسی خانقاہیں قائم ہوئیں کہ تخت نشینوں کو رشک آنے لگا متلاشیانِ حق علم وہدایت کے لیے ان کی درگاہوں پر حاضر ہوتے رہے اور دین ودنیا کی نعمتیں پاتے رہے یہ وجود جب کبھی کمیاب ہوئے تو طلب خیر کے متوالوں کی بے قراری امڈ آئی اور ''انسانم آرزو است'' کی پکار اُٹھنے لگی سماج ان کی تشریف آوری سے فلاح پانے کا آرزومند ہوا، باغی سماج اطاعت شناسی کے جوہر سے تابدار ہوا، اسلام کے تمکن اور رسوخ میں انہوں نے جو کردار ادا کیا وہ قابلِ تحسین ہے، انہیں کرامات کے ترازوں میں نہ تولا جائے۔ بقول اقبال:

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں(۴)

سماج کو پاکیزگیٔ نفس کے شعور سے آگاہ کرنے کے لیے حضرت پیر پیراں نے فرمایا: تقویٰ یہ ہے کہ

کسی شخص کے دل میں جو کچھ ہے اگر وہ طباق میں رکھ کر اسے بازار میں پھرنا پڑے تو اسے اس میں عار نہ ہو۔(۵) آج مذہبی تنگ نظری، تعصّبات کی بنا پر قتل گری، انسانی دہشت گردی، خون ریزی، انسان دوستی سے انکار تحمل و برداشت کے فقدان کا منہ بولتا ثبوت ہے ایسے حالات میں سچا صوفی محبت اور انسان دوستی کا داعی رہا ہے۔ دوسروں کی باتوں کو برداشت کرنا انکسار سے پیش آنا شفقت کرنا انبیاء و اولیاء کا خاصا تھا وہ دوسروں کی دی ہوئی اذیت برداشت کرتے تھے۔ انہوں نے سماج کی تربیت انتقام لینے کے طریق سے نہیں کی بلکہ علاج کے طور پر ہمدردی سے کی اور انسانیت کو صداقت شعاری کی اہمیت سے روشناس کیا۔

شیخ شہاب الدین سہروردی فرماتے ہیں کہ ’’صوفیہ کا اہم خلق تحمل اور مدارت ہے تحمل سے نفس کا جوہر کھلتا ہے۔‘‘(۶)

سماج کی ترقی کے لیے سب سے بڑی ضرورت اس میں انسانی ہم آہنگی کا ہونا ہے ترقی کے ضامن مادی وسائل کا وافر مقدار میں ہونا ہی نہیں ہوتا بلکہ افراد کی ذہنی آسودگی سکون، طمانیت قلبی سے ان کا بہرہ ور ہونا بھی ضروری ہے۔ لازم ہے کہ وہ خدمتِ خلق کے جذبے کے حامل اور ہم مشربیت کی روایت کے پاسدار ہوں یعنی نہ دوسروں کے مذہب و مسلک عقیدہ اور عقیدتوں کی تنقیص کریں اور نہ ان پر تنقید بلکہ ایک حد تک دوسروں کے مذہب و مسلک کا احترام کریں اس مقصد کے حصول کے لیے تصوف جو وحدتِ خداوندی اور وحدتِ انسانی، حسنِ خلق، خدمتِ خلق اور دوسروں کے جذبات و افکار کے احترام کی روایت پر مبنی ہے کے اختیار کرنے سے سماج صحیح معنوں میں ترقی کر سکتا ہے۔ تصوف میں مذہب و مسلک اخلاق و انسانیت آموز مطالب کا ایک عظیم سرمایہ موجود ہے۔ اسی عالمگیر افادیت اور اہمیت کے پیشِ نظر آج تعلیمی اداروں میں تصوف سنٹر، تصوف چیئرز قائم کرنے، تصوف کانفرنسز منعقد کروانے، تصوف کے رسائل و جرائد کے اجراء کا اہتمام کرنے کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔

صوفیہ نے توحید کی تلقین اور انسان دوستی کو ساتھ ساتھ رکھا کیونکہ ان کے نزدیک سارے انسان جسدِ واحد کی طرح ہیں جس طرح جسم کے اگر ایک عضو کو درد ہوتا ہے تو دوسرے اعضاء بھی درد محسوس کرتے ہیں۔

حضرت ابوالحسن خرقانی کا قول ہے کہ اگر ترکستان سے شام تک کسی کے پاؤں میں کانٹا چبھتا ہے تو وہ ہمارے پاؤں میں چبھتا ہے اگر کسی کے پاؤں میں چوٹ لگتی ہے یا درد ہوتا ہے تو وہ غم اور صدمہ ہمیں بھی محسوس ہوتا ہے۔

بایزید رحمۃ اللہ علیہ دعا فرمایا کرتے تھے ’’اے اللہ! میرا وجود اتنا بڑا کر دے کہ دوزخ میں صرف میرا وجود سما

جائے اس میں کسی اور کی گنجائش نہ رہے۔‘‘(۷)

حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ صوفی اس وقت تک صوفی نہیں جب تک تمام خلقِ خدا کو اپنے عیال کی طرح نہ سمجھے صوفی بزرگ عزالدین نسفی فرمایا کرتے تھے کہ چھوٹا ہو یا بڑا سب کو عزیز جانو تا کہ چھوٹے بڑے تمہیں عزیز جانیں دوست تو زیادہ دوست بنے اور دشمن زیادہ دشمن نہ بنے بلکہ دوست بن جائے۔

ایک عورت نے مالک بن دینار رحمۃ اللہ علیہ کو ’’ریاکار‘‘ کہہ کر پکارا، مالک بن دینار رحمۃ اللہ علیہ نے جواباً فرمایا بہت خوب! دنیا والے میرا نام بھول گئے تھے تم نے دوبارہ بتا دیا۔

ایک شخص نے حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہ کو گالی دی آپ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اگر تم سچے ہو تو اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائے۔

کچھ لوگوں نے خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ فلاں شخص آپ کی غیبت کر رہا تھا تو آپ نے بطورِ تحفہ تازہ کھجوریں بھیجتے ہوئے پیغام دیا کہ سنا ہے تم نے اپنی نیکیاں میرے اعمال نامے میں درج کرا دی ہیں میں اس کا معاوضہ ادا نہیں کر سکتا۔

حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ حسنِ خلق تو یہ ہے کہ ’’مخلوق کو ایذاء نہ پہنچاؤ اور لوگوں کی دی ہوئی تکالیف کو برداشت کرو۔‘‘(۸)

مباش در پی آزار ہر خواہی کن
کہ اکٹھا غیر ازین گناہی نیست

’’یعنی جو برائی چاہو کر لو لیکن دوسروں کو ایذاء نہ پہنچاؤ کیونکہ ہمارے مذہب میں اس سے بڑا کوئی اور گناہ نہیں۔‘‘(۹)

ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ’’جب سے میں نے مخلوقِ خدا سے صلح کی ہے پھر کبھی مخلوقِ خدا سے جنگ نہیں کی اور جب سے میں نے اپنے نفس سے جنگ کی ہے پھر اس سے کبھی صلح نہیں کی۔‘‘

گویا توحید اور انسان دوستی کے مطالب تصوف کو ہر انسان کے لیے مفید بناتے ہیں حسنِ خلق اور انسان دوستی کے تصورات میں انسان کی دنیا اور آخرت دونوں میں بھلائی ہے۔ توحید خالص اختیار کرنے سے بندہ مؤمن بنتا ہے اور یوں اس کی آخرت سنور جاتی ہے انسان دوستی اپنانے سے وہ معاشرے کا معتبر اور مفید فرد بن جاتا ہے یوں اس کی دنیا سنور جاتی ہے

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ ’’جب میں عرش خداوندی کے پاس پہنچا تو میں نے

دریافت کیا کہ اللہ کہاں ہے؟ جواب ملا اللہ کو زمین کے شکستہ قلوب میں تلاش کرو۔''

نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ''قیامت کے دن سب سے بڑا انعام اس کو ملے گا جس نے مسلمانوں اور عام انسانوں کی خوشی کے لیے کام کیا۔''(۱۰)

یہ نظریات تصوف کی عالمگیر اہمیت اور اس کی ضرورت آنے والی صدیوں میں بھی قلم کرتے ہیں موجودہ زمانے میں نوجوان نسل جو بے راہ روی افراتفری بدسکونی کا شکار ہو رہی ہے والدین واساتذہ عاجز آگئے ہیں اور ان کے راہِ حق سے گمراہ ہونے پر شرمندہ و پریشان ہیں۔

تو جب ایسی صورتحال تھی تو اولیاء اللہ اور صوفیہ کرام نے نوجوان نسل کو بڑی شفقت ومحبت اور دعا سے سنبھالا۔ نئی نسل کے سامنے ان کا اپنا طریقِ زندگی بہت احسن تھا۔ حضرت ابوالخیر ابوسعید ایک روز نیشاپور کے قبرستان میں بزرگوں کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے گئے وہاں اوباشوں کی ایک جماعت شراب پی رہی تھی اور گانے بجانے میں مصروف تھے آپ کے ساتھ نہایت برہم ہوئے اور انہیں مارنے پیٹنے کا ارادہ کیا شیخ نے انہیں روک دیا اور اوباشوں کے پاس جا کر فرمایا:

''اے اللہ! جس طرح اس جہاں میں انہیں شادمانی دی ہے اسی طرح آخرت میں بھی انہیں شادمانی عطا کر''

سب اوباش شیخ کا یہ سلوک دیکھ کر تائب ہو گئے ایک نوجوان بَربَط شراب کے نشے میں مست جا رہا تھا اس دور کے مشہور صوفی حضرت عثمان حیری کو دیکھا تو فوراً برتن چھپالیا اور ٹوپی اوڑھ لی آپ نے اس سے نہایت نرمی سے کہا:

''ہم دونوں بھائی ایک جیسے ہیں۔''

حضرت عثمان حیری کا یہ سلوک دیکھ کر اس نے توبہ کر لی آپ اس کو اپنے ساتھ لائے غسل کروایا خرقہ پہنایا اور دعا فرمائی۔

''اے اللہ جو میرے بس میں تھا وہ میں نے کر دیا اب جو تیرے اختیار میں ہے اس کی تکمیل فرما۔''

ان کی اس دعا نے شرابی نوجوان میں ایسا روحانی کمال پیدا کر دیا کہ حضرت عثمان حیری رحمۃ اللہ علیہ بھی حیران رہ گئے۔

ایک روز شیخ ابوعلی ثقفی رحمۃ اللہ علیہ قرآن پاک پڑھ رہے تھے ان کے ہمسائے میں ایک کبوتر باز رہتا تھا وہ

اپنے کبوتروں کو اُڑانے کے لیے ڈھیلے مارتا تھا جس سے حضرت ابوعلی ثقفی رحمۃ اللہ علیہ بہت تنگ تھے ایک اور ڈھیلا ان کے سر پر لگا جس سے ان کا سر پھٹ گیا آپ کے مریدین نے کہا کہ ہم کوتوال رپورٹ درج کرائیں گے شیخ ابوعلی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ایک خدمت گزار کو بلایا اور کہا کہ فلاں جنگل سے لکڑی کاٹ لاؤ جب وہ آیا تو آپ نے ہمسایہ کو وہ لکڑی بھجوائی اور کہا کہ اس سے کبوتر اُڑایا کرو ڈھیلوں سے نہ اُڑایا کرو۔(۱۱)

دوسروں کی باتوں کو برداشت کرنا دوسروں کے ساتھ انکسار سے پیش آنا، سب کی عزت کرنا، سب پر شفقت کرنا، انبیاء واولیاء کا اخلاق ہے۔

دولت یا حکومت کا ہونا تصوفِ اسلامی کی روایات کے منافی نہیں تصوف میں دنیا بُری نہیں دنیا داری بُری ہے، دولت بُری نہیں دولت کی محبت بُری ہے جو اللہ تعالیٰ سے غفلت کا سبب بنتی ہے اس لیے صوفیہ کرام نے بڑے بڑے جابر حکمرانوں کے سامنے کلمۂ حق کہہ کر عوام کے حقوق کی ترجمانی کی اور ان کے حقوق کے لیے آواز بلند کی اور اپنی تالیفات، ملفوظات اور حکایات میں ان پر روشنی ڈالی یوں ان کی آواز نے آمرانہ دور میں ایک طور پر حزبِ اختلاف کا کردار ادا کیا۔ جابر حکمران کے سامنے اہلِ حق کی حق گوئی اور بے باکی تصوف کی تاریخ کا ایک سنہرا باب ہے انہوں نے ہمیشہ حکمرانوں کو عوام کے مسائل حل کرنے اور معاشرے میں عدل وانصاف قائم کرنے کی تلقین کی ہے وہ عوام میں سے تھے اور مرجع خلائق رہتے تھے۔ بقول علامہ:

اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی(۱۲)

وقت کے مشہور صوفی وزاہد حضرت طاؤس یمانی رحمۃ اللہ علیہ کو خلیفۂ ہشام نے اپنے دربار میں بلایا جب وہ شاہی دربار میں حاضر ہوئے تو شاہی مسند کے پاس جوتے اتار دیئے اور کہا ہشام السلام علیکم! ہشام کو بہت غصہ آیا اس نے کہا تم نے چار گستاخیاں کی ہیں میری مسند کے پاس جوتا اتارا، مجھے میرے نام سے پکارا اور میرے ہاتھ پر بوسہ نہیں دیا اور مجھے امیر المومنین نہیں کہا، حضرت طاؤس یمانی رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا میں پانچ بار خدائے رب العزت کے گھر میں اس کے سامنے جوتے اتارتا ہوں وہ سب کا بادشاہ ہے احکم الحاکمین ہے وہ تو اس بات پر غصے نہیں ہوتا اور یہ کہ میں نے تمہیں امیر المومنین اس لیے نہیں کہا کہ تمام لوگ تمہیں امیر المومنین نہیں مانتے میں نے سوچا کہ میں جھوٹ بولوں گا اگر تمہیں امیر المومنین کہا۔ میں نے نام سے پکارا ہے کنیت سے نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دوستوں کو نام سے یاد کی ہے اور کہا یا داؤد، یا موسیٰ، یا عیسیٰ اور اپنے دشمنوں کو کنیت سے تبت یدا ابی لھب اور بوسہ نہ دینے کا معاملہ تو میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سنا ہے کہ کسی کے ہاتھ کو بوسہ دینا جائز نہیں البتہ بیوی کے ہاتھ کو محبت سے اور اپنے بچوں کے ہاتھ کو شفقت سے ہشام نے کہا کوئی

نصیحت کریں۔ کہا میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سنا ہے کہ دوزخ میں بڑے بڑے سانپ اور بچھو ہیں جو اس امیر کے منتظر ہیں جو اپنی رعایا کے ساتھ عدل نہیں کرتے کہا اور وہاں سے اُٹھ کر چلے گئے۔

ایک حاکم مالک بن دینار رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے سے فخر وغرور سے گزرا مالک بن دینار نے فرمایا کہ تمہیں معلوم نہیں کہ اس طرح چلنا ناپسندیدہ ہے؟ اس نے کہا تمہیں معلوم نہیں میں کون ہوں؟ مالک بن دینار رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہاں! مجھے معلوم ہے کہ تم پہلے بھی آلائش تھے (قبل از ولادت) آخر کار (مرنے کے بعد) آلائش بن جاؤ گے اور درمیانی عرصہ میں بھی آلائش اُٹھائے پھرتے ہو۔(۱۳)

نظام الدین اولیاء فرمایا کرتے تھے کہ قیامت کے دن سب سے بڑا انعام اس کو ملے گا جس نے مسلمانوں اور عام انسانوں کی خوشی کے لیے کام کیا۔ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اس فکر کو اس طرح بیان کیا ہے:

نہیں فقر و سلطنت میں کچھ امتیاز ایسا
وہ نگاہ کی تیر بازی یہ سپاہ کی تیر بازی(۱۴)

اس لیے صوفیہ کرام کہتے ہیں کہ صاحبان جاہ وحشم سے میل جول رکھنا کہ دوسروں کے کام کے لیے اپنا اثر ورسوخ استعمال کیا جائے ان لوگوں کا کام ہے جنہوں نے اپنی ذات کو فنا کر دیا اور پھر فنا کے بعد حق کو پالیا ان کے سارے کام اللہ تعالیٰ کے لیے ہوتے ہیں۔ صوفیہ خود اپنے مسلمان بھائیوں کی حاجت روائی کے لیے مال خرچ کرتے اور اپنا اثر ورسوخ بھی کام میں لاتے ہیں انہوں نے اپنی شفقت ومحبت صرف مسلمان طبقے کے لیے نہ رکھی بلکہ اسے عالمگیریت اور ہمہ گیریت سے مزین کیا اور دوسروں کے مسلک اور عقیدہ پر تنقید کی بجائے ان کا احترام لازم قرار دیا۔

حضرت بایزید بسطامی کے پڑوس میں آتش پرست رہتا تھا افلاس کی وجہ سے وہ ایک دن چراغ روشن نہ کر سکا تاریکی کی وجہ سے اس کا بچہ رو رہا تھا بایزید خود چراغ جلا کر اس کے ہاں رکھ آئے اور بچہ خاموش ہو گیا۔ بچے کے والدین نے کہا کہ جب بایزید کی روشنی آ گئی ہے تو ہم پر افسوس کہ ہم تاریکی کی زندگی بسر کریں، فوراً مسلمان ہو گئے۔(۱۵)

بندہ عشق از خدا گیرد طریق
می شود بہ کافر و مومن شفیق(۱۶)

''بندہ حق حق تعالیٰ کی پیروی میں مومن ہو یا کافر سب کے ساتھ شفقت سے پیش آتا ہے۔''

سماج میں محبت بانٹنے سے لوگوں کی طرف سے انہیں محبت بھرے جذبات موصول ہوئے آباؤ اجداد

کے ادیان کو ترک کر کے مسلمان ہو گئے اور انہوں نے اپنے شہروں، محلوں، علاقوں، اداروں اور یونیورسٹیوں کے نام ان وجود سعید کے نام منسوب کر دیے۔ ان کی نظروں میں وہ شہر متبرک ہو گئے مثلاً ملتان شریف (اولیاء کا شہر) اُچ شریف، داتا کی نگری (لاہور) تونسہ شریف پاکپتن شریف، جہانیاں جہاں گشت، اجمیر شریف، سلمانکی محلہ، (انڈیا میں) اور قونیہ (ترکی) کا نام لیا جائے تو اگلا نام جو ذہن میں آتا ہے وہ مولانا جلال الدین رومی کا ہے۔

ایک صوفی شیخ ابوالعباس نہاوندی کی خدمت میں ایک عیسائی مسلمان کا روپ دھار کر بطورِ امتحان چار مہینے ان کی خدمت میں رہا شیخ نے ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا، چار ماہ کے بعد عیسائی نے رخصت کی اجازت چاہی، شیخ نے آہستہ سے اس کے کان میں کہا یہ جوانمردی نہیں کہ تم آؤ درویشوں کے ساتھ نان و نمک کھاؤ ان کی مجلسوں میں بیٹھو اور پھر آخر میں جیسے آئے تھے ویسے ہی بیگانے چلے جاؤ یہ سن کر عیسائی سکتے میں آ گیا۔ شیخ کی فراست وولایت اور اسلام کی حقانیت کا سچے دل سے اعتراف کیا اور اور مسلمان ہو گیا شیخ کی صحبت میں رہ کر ایسا مقام ومرتبہ پایا کہ ان کی وفات کے بعد شیخ کا خلیفہ بنا۔[(۱۷)]

تصوف کے مثبت اثرات کے تحت مشرقی ادب میں فحاشی عریانی خوشامد بے جامدح اور قصیدہ گوئی کی روایت کم اور کمزور ہوئی۔ تصوف نے تعصّباتِ مذہبی کو ختم کر کے اتحاد کا درس دیا ان کے نزدیک تمام مخلوق خدا وند تعالیٰ کے دامنِ ربوبیت میں پل رہی ہے خواہ وہ شیعہ ہو، سنی ہو، وہابی ہو، یہودی ہو، کافر ہو، مشرق کا رہنے والا ہو خواہ مغرب کا اردو بولتا ہو یا انگریزی، صوفی صاف دل سب سے محبت کرتا ہے۔ گویا انہوں نے اپنے حسنِ عمل اور حسن اخلاق سے اسلام کی روح کی تبلیغ کی ہے۔

موجودہ دور میں متصوفین صوفی پن کا ڈھونگ رچا کر جنگلوں میں نکل جانے طہارت و پاکیزگی کے شرعی اصولوں کو طاق نسیان میں رکھ کر لوگوں کی نظروں میں اپنے لیے متبرک مقام کا طالب ہے، جبکہ نظام الدین اولیاء فرماتے ہیں ترکِ دنیا یہ نہیں کہ انسان ننگا پھرے، لنگوٹ باندھے ترک دنیا تو یہ ہے کہ دوسروں کو کھلائے، زخمی دلوں پر شفقت کرے، مستحقین کی مدد کرے اور اپنا دل فانی دنیا کی محبت سے خالی رکھے، کرامات دکھا کر لوگوں کو مرید نہ کرے۔ حضرت ابوسعید ابوالخیر سے کسی نے کہا کہ فلاں شخص ہوا میں اُڑتا ہے فرمایا مکھی اور چیلیں بھی اُڑتی ہیں کسی نے کہا فلاں شخص ایک لمحہ میں ایک شہر سے دوسرے شہر پہنچ جاتا ہے شیخ نے کہا شیطان بھی ایک لمحے میں مشرق سے مغرب پہنچ جاتا ہے، شیخ نے کہا ایسی باتوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ سچا صوفی وہ ہے جو خدمتِ خلق کرے، خلقِ خدا کے بیچ زندگی بسر کرے ان کے ساتھ لین دین کے معاملات

کرے ان سے اچھا میل رکھے (۱۸) موجودہ دور میں متصوفین نے اپنے لیے ہاتھ سے روزی کمانا ناجائز سمجھ رکھا ہے، بہت سے مفت خور متولیوں نے صوفیہ کے مزارات کو جھاڑ پھونک اور نذر و نیاز کے اڈوں میں تبدیل کر کے اپنی آمدنی اور لوٹ مار کا ذریعہ بنالیا ہے۔

شاہ رستہ کون وکھاوے
حد لٹن لگے پیر (۱۹)

اس قسم کا تصوف بصیرت وفراست جرأت و جسارت غیرت ایمانی رزقِ حلال کے حصول کا درس نہیں بنتا، اکتساب رزق کا اہتمام تمام اولیاء وصوفیہ نے اپنے ہاتھ سے سنتِ انبیاء علیہم السلام کی پیروی کرتے ہوئے کیا۔

ایک دن شیخ علاء الدولہ سمنانی درویشوں کے ساتھ روئی سے بنولہ نکال رہے تھے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کبھی بیکار نہ بیٹھتے تھے اور نہ بیکار لوگوں کو پسند کرتے تھے۔ (۲۰)

صوفی کا معاشرے میں ایک فعال رکن ہونا ضروری ہے اور رہبانیت تو اسلامی تصوف کا جز نہیں اس لیے صوفیہ سماجی دکھوں کے احساس کو جانتے تھے انہوں نے خاص طور پر امراء کی توجہ اس طرف مبذول کروائی اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی اکثریت انہیں میں سے تھی۔ بایزید بُسطامی سقا تھے، سری سقطی پر چون فروش تھے، جنید بغدادی شیشہ گر، خیر نساج جولاہا، ابوالعباس آملی قصاب، ابوحمزہ بغدادی بزّاز، ابونصر طوسی زین ساز، مشہور صوفی ابوعلی ''رقاق'' ان کی مختلف پیشوں سے وابستگی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ وہ معاشرے پر بوجھ نہ تھے۔

عالمِ کفر مسلمانوں کے اخلاق، تہذیب اور مذہبی روایات کو ختم کرنا چاہتا ہے۔ مذکورہ تصوف کے لائحہ عمل کی روشنی میں بڑے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ آنے والی صدیوں میں اگر کوئی مسلک زندہ رہ سکتا ہے اور انسانیت کے لیے مفید ہو سکتا ہے تو وہ خالص اسلامی تصوف ہے جس میں وحدت حق وحدتِ انسانی پر ایمان کے ساتھ ساتھ دین و دنیا کا توازن ہے۔

عصرِ عاضر میں تصوف اور صوفیہ میں جس عالمگیر دل چسپی کا اظہار ہو رہا ہے وہ بعض اعتبار سے حیرت انگیز ہے اس دلچسپی کے محرکات و اسباب مختلف نوعیت کے ہیں۔ ایک طرف علمی حلقوں میں یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ دنیا کے مختلف علاقوں میں اسلام کا اثر و نفوذ صوفیہ کی مساعی کا نتیجہ تھا دوسری طرف تصوف میں دلچسپی کا محرک مادیت کے خلاف انسان کا فطری ردِ عمل ہے۔ انسانی قلب جس سکون کی تلاش میں ہے وہ زر اور زور کی

دسترس سے باہر ہے ضرورت یہ ہے کہ اب انسان اپنا تعلق اپنے رب سے جوڑے اور اپنی زندگی کو روحانی اور اخلاقی قدروں کی چاکری میں بسر کرنا سیکھے۔

اگر کسی فرد یا قوم کو انسانی عظمتوں کے ساتھ زندہ رہنا ہے تو اسے قاسمِ نعمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ اپنی نسبت کو مستحکم اور ان کی اطاعت کو لازم کرنا ہوگا پہلی نسلوں کی ضرورت بھی یہی تھی اور آئندہ نسلوں کی ضرورت بھی یہی ہے اسی میں حیات سرمدی اور ابدی سکون کا راز مضمر ہے۔ انہی محرکات کے پیش نظر صوفیہ کی زندگی انسانی فلاح، انسان کی اخلاقی تربیت کی کوششوں کی حقیقی نوعیت کو سمجھنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

بہرحال: تصوف اسلامی تعلیمات کا وہ اظہار جسے ایک حق آگاہ انسان کو قائم رکھنا ہے تاکہ ایسی رحمتوں بھرا معاشرہ قائم ہو سکے جو اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے جو رحمان ورحیم ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مطلوب ہے جو رحمۃ للعالمین ہیں اور جو قرآن کا مقصود ہے جو تمام تر رحمت وشفا ہے۔

○○○

حوالہ جات

۱۔ آر۔جی Colling wood، تعلیم، سماج اور کلچر، ترجمہ: اختر انصاری، لاہور: بک ھوم، ۲۰۰۵ء

۲۔ میاں عبدالرشید، اسلام اور تعمیرِ شخصیت، لاہور: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ لاہور، ص ۵

۳۔ الطوسی، ابونصر، سراج، اللمع فی التصوف، اسلام آباد: ادارۂ تحقیقات اسلامی، جامعۃ اسلامیۃ العالمیۃ، ص ۵۹

۴۔ علامہ، محمد اقبال، بانگ درا، طلوعِ اسلام، لاہور: اے۔این۔اے پرنٹرز

۵۔ الطوسی، اللمع فی التصوف، ص ۶۳

۶۔ القشیری، ابوالقاسم، رسالہ قشیریہ، مترجم: مفتی محمد صدیق ہزاروی، لاہور: مکتبہ اعلی حضرت، ۲۰۰۹ء، ص ۳۵

۷۔ صدیقی، ظہیر احمد، ڈاکٹر، تصوف جدید معاشرے میں، لاہور: تخلیقات، ۲۰۱۲ء، ص ۴۹

۸۔ اُنظر، الطوسی، اللمع فی التصوف، ص ۶۴۔۷۵

۹۔ الشیرازی، محمد حافظ، دیوان حافظ خواجہ شمس الدین غزلیات، شمارہ ۶۲، تاریخ نشر: ۵۱۔۸۲

۱۰۔ الطوسی، اللمع فی التصوف، ص ۷۷

۱۱۔ عطار، فرید الدین، تذکرہ اولیاء، مترجم: نذیر احمد سیماب قریشی، لاہور: شیخ برکت علی اینڈ سنز تاجرانِ کتب کشمیری بازار، ص ۳۵۰

۱۲۔ علامہ، محمد اقبال، بال جبریل، ص ۴۰۲، شعر کا پہلا مصرعہ: آئین جواں مرداں حق گوئی و بیباکی ہے

۱۳۔ عطار، تذکرہ اولیاء، ص ۱۹۳

۱۴۔ علامہ، محمد اقبال، بالِ جبریل، ص ۳۶۶

۱۵۔ عطار، تذکرہ اولیاء، ص ۳۸

۱۶۔ علامہ، محمد اقبال، جاوید نامہ، خطاب بہ جاوید (سخنی بہ نثراد نو)، لاہور: اقبال اکادمی، ص ۲۳۱

۱۷۔ عطار، تذکرہ اولیاء، ص: ۴۵

۱۸۔ ایضاً، ص ۵۰

۱۹۔ سجاد بخاری، کچے دا ہتھ، لاہور: گورا پبلشرز، ۲۵ لوئر مال، ۱۹۹۵ء، ص ۱۷

۲۰۔ سمنانی، علاءالدین، مجلس چھل، مرتبہ: سجستانی، محمد اقبال شاہ، تہران، ص ۲۰

ooo

الشیخ غلام مرتضیٰ بیربلوی رحمۃ اللہ علیہ اوران کی تصانیف
تعارف وتبصرہ

کاشف مبین ☆

Abstract:

This article entitled ''الشیخ غلام مرتضیٰ بیربلوی رحمۃ اللہ علیہ اوران کی تصانیف: تعارف وتبصرہ'' deals with the contribution of Allama Ghulam Murtaza in Islamic literature. Al-Sheikh Ghualm Murtaza was a great and renowned personality of 19th century. He was a good Sufi and great scholar of Sub-Continent. His work is multidimentions. Most of his work is in Tafseer and Hadith. He spend his most of his life in teaching and spreading of Islam.

Key Words:

Great, Renowned, Personality, Sub-Continent, Tafseer, Hadith, Teaching, Islam.

انسان کواللہ نے کرامت وعظمت کا تاج پہنا کرمخلوقات میں سے سب سے اشرف تخلیق فرمایا۔انسان کی تخلیق جسم اورروح دونوں سے مرکب ہے۔ان دونوں کی قوت وصلاحیت غذا پر موقوف ہے۔جس طرح انسانی جسم اپنی بقا کے لیے ظاہری غذا کا محتاج ہوتا ہے اسی طرح انسانی روح اپنی قویٰ کی سلامتی اورصفا کے لیے باطنی اورملکوتی غذا کی محتاج ہے۔انسانی جسم اپنی صلاحیتوں کی نشوونما اگراکل وشرب سے پاتا ہے تو انسانی روح اپنی عظمتوں کی راہ پرعمل وعرفاں سے گامزن ہوسکتی ہے۔

☆ ایم۔فل اسکالر، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

نبی مکرم، رحمتِ عالم ﷺ کی بعثت کا مقصد بھی انسان کی ان عظمتوں اور رفعتوں کو تعلیم وتزکیہ کے ذریعے بامِ عروج تک پہنچانا تھا۔ قرآن مجید نے حضرت ابراہیمؑ کی زبان سے رسول معظم ﷺ کی بعثت کا یہی مقصد ان الفاظ میں بیان کیا:

"رَبَّنَا وَابعث فِيهِمْ رَسُوْلاً مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ۔"(۱)

علمائے ربّانیین اور صوفیہ نے ہر خطے اور ہر دور میں انسانی روح کی بالیدگی کے انہی تقاضوں کے پیشِ نظر تعلیم وتعلم، درس وتدریس، تصنیف وتالیف اور سلوک وارشاد کے ذریعے افرادِ امت کی راہنمائی کا فریضہ سر انجام دیا۔ برصغیر کے علمائے کبار اور صوفیائے عظام میں سے ایک عظیم شخصیت مولانا حافظ غلام مرتضیٰ بیربلوی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔ ذیل کی سطور میں اس عظیم عالم وصوفی اور ان کی تصانیف کا تعارف وتبصرہ پیش کیا جا رہا ہے۔

خاندانی پس منظر:

مولانا حافظ غلام مرتضیٰ بیربلوی رحمۃ اللہ علیہ کا تعلق اس خاندان سے ہے جو برصغیر پاک وہند میں "اعوان" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ خاندان فاطمی سادات کے بعد اپنے اعلیٰ نسب اور علمی وروحانی روایات کی بنا پر انتہائی قابلِ احترام سمجھا جاتا ہے۔ اس خاندان کا نسب "قطب شاہ" سے ہوتا ہوا "محمد بن الحنفیہ" سے جا ملتا ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے غیر فاطمی فرزند تھے۔ خلافت راشدہ کے اختتام کے بعد مختلف علاقوں سے ہجرت کرتے کرتے یہ خاندان گیارھویں صدی عیسوی، سلطان محمود غزنوی کے زمانے میں پنجاب میں آباد ہو گیا جو اس وقت غزنوی سلطنت کا حصہ بن چکا تھا۔ یہاں سے یہ لوگ کوہستان نمک کی وادیوں، دامنِ کوہ، وادئ سون اور پوٹھوہار کے علاقہ میں پھیل گئے۔

سلطان محمود غزنوی نے کفر کے خلاف جنگ میں اس قبیلہ کی خدمات کو سراہا اور انہیں "عون" بمعنی مددگار لقب دیا۔ رفتہ رفتہ "عون" کی جمع "اعوان" اس قبیلہ کا نام مشہور ہو گیا۔ (۲)

مولانا سلطان حامد قادری "اعوان" خاندان کے اخلاق وخصائل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اعوانِ قبیلہ میں ہاشمی اور علوی نسب کے خصائل وفضائل کی علامات اب بھی پائی جاتی ہیں۔ یعنی ان کے مرد وخواتین سخی، بہادر، صاحب حیا ووفا، دیانت دار، عہد کے پکے اور کثیر صدقہ وخیرات کرنے والے ہیں۔"(۳)

سلسلہ قادریہ کے مشہور صوفی اور شاعر حضرت سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ (۱۰۳۹ھ۔۱۱۰۴ھ) مدفون شورکوٹ ضلع جھنگ کا تعلق بھی اسی خاندان سے ہے۔

مولانا حافظ غلام مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ کے آباؤاجداد:

مولانا حافظ غلام مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ کے آباؤاجداد کئی پشتوں سے عالم باعمل اور صوفی چلے آرہے ہیں۔ علاقہ کوہستان کی وادئ سون سکیسر (ضلع خوشاب) کا ایک مشہور گاؤں سودھی اس خاندان کا مسکن تھا۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کے اجداد کی چوتھی پشت کے بزرگ میاں جان محمد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے استاد ومربی حضرت حافظ مہر علی رحمۃ اللہ علیہ کے فرمان کے مطابق تحصیل علم کے لیے علاقہ کوہستان سے ہجرت کی اور مختلف علاقوں کے علماء سے اکتساب علم کے بعد ضلع سرگودھا کے شہر جھاوریاں کے قریب گاؤں چک میاں موسیٰ میں ڈیرہ لگا لیا۔ میاں جان محمد رحمۃ اللہ علیہ کے بیٹے مولانا علیم اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور پوتے صدر دین رحمۃ اللہ علیہ بھی ایک جید عالم دین تھے۔ چک میاں موسیٰ سے آٹھ نو کلومیٹر دور دریائے جہلم کے جنوبی کنارے ایک قریہ ''بیربل'' کے نام سے مشہور تھا۔ یہاں کے لوگ اگرچہ انتہائی آسودہ حال تھے تاہم دین کے احکام سے بالکل ناآشنا تھے۔ اہل بیربل حافظ غلام مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ کے دادا جان مولانا صدرالدین رحمۃ اللہ علیہ کو بڑی سعی اور اصرار کے بعد بیربل گاؤں میں لے آئے۔

بیربل آکر مولانا صدرالدین رحمۃ اللہ علیہ نے تبلیغ واشاعت دین کا سلسلہ شروع کیا۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں دو بیٹے پیدا ہوئے۔ جن میں سے ایک بیٹے محمد اسلم رحمۃ اللہ علیہ تھے جو ایک جید عالم دین، مدرس اور صاحب زہد وورع تھے۔ بیربل کی جامع مسجد میں قرب وجوار سے لوگ ان کا خطبہ جمعہ سننے آتے۔ اس قدر علم فقہ کے ماہر تھے کہ علاقہ میں ان کا فتویٰ بھی چلتا تھا۔ مولانا محمد اسلم رحمۃ اللہ علیہ کے بیٹے محمد شریف عین عالم شباب میں فوت ہو گئے اور کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ اس وقت آپ رحمۃ اللہ علیہ کی عمر ساٹھ سال سے متجاوز کر چکی تھی کہ مخلصین نے بااصرار آپ رحمۃ اللہ علیہ کی دوسری شادی کروائی جس کے بعد مولانا حافظ غلام مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ پیدا ہوئے۔

مولانا حافظ غلام مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ کا سارا خاندان، علم وتقویٰ اور زہد وورع میں معروف تھا۔ حتیٰ کہ آپ کے خاندان کی خواتین کو بھی علوم دینیہ میں کمال حاصل تھا۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کے ذاتی کتب خانہ میں ''مشکوۃ المصابیح کا ایک نسخہ آپ رحمۃ اللہ علیہ کی دادی جان کا تحریر کردہ موجود رہا۔ مولانا محبوب عالم سوہاوی نے آپ رحمۃ اللہ علیہ کے منظوم سوانح میں اس نسخہ کو بذاتِ خود پڑھنے کا ذکر اس طرح کیا ہے:

نیست فقط علم بقول رجال

حافظہ و عالمہ مستورہ حال

دفتر مشکوۃ کہ من خواندہ ام

از قلم جدہ اش آمد رقم(۴)

''مولانا محبوب عالم سوہاوی فرماتے ہیں کہ آپ رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان میں علم وفضل نہ صرف مرد حضرات کا خاصہ تھا بلکہ خواتین بھی اس میں غیر معمولی دسترس رکھتی تھیں۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کی دادی جان کے ہاتھ کا لکھا ہوا مشکوۃ کا نسخہ میں نے خود پڑھا ہے۔''

مولانا حافظ غلام مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ ۱۲۵۱ ھ بمطابق ۱۸۳۵ء میں مولانا حافظ محمد اسلم بیربلوی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں پیدا ہوئے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت سے قبل ایک کامل بزرگ نے آپ رحمۃ اللہ علیہ کی پیدائش اور بلند مرتبت کی بشارت دے دی تھی۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کے والد گرامی ایک عظیم باعمل عالمِ دین اور روحانی پیشوا تھے۔ والدہ ماجدہ بھی انتہائی نیک خاتون تھیں۔(۵)

ابتدائی تعلیم وتربیت:

مولانا حافظ غلام مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد مولانا حافظ محمد اسلم صاحب سے حاصل کی۔ جلد ہی قرآن مجید حفظ کرلیا اور والد گرامی سے ہی ابتدائی فارسی، رسائل سکندر نامہ بعض کتب فقہ اور فتاوی مسعودی وغیرہ پڑھیں۔ ابھی کم سن ہی تھے کہ آپ کے والد بزرگ وار کا انتقال ہوگیا۔ وصال کے وقت کسی مخلص نے آپ رحمۃ اللہ علیہ کے والد گرامی سے کہا کہ اپنے اس اکلوتے بیٹے کوکسی کی کفالت میں دے جائیں۔ تو آپ رحمۃ اللہ علیہ کے والد گرامی نے آسمان کی طرف دیکھا اور فرمایا حوالہ بخدا۔ اس مخلص نے تین مرتبہ اپنی تجویز دہرائی اور تینوں مرتبہ آپ رحمۃ اللہ علیہ کے والد صاحب نے یہی جواب دیا۔(۶)

مولانا محبوب عالم سوہاوی نے اپنے منظوم کلام میں اس واقعہ کو یوں اشعار کا جامہ پہنایا:

حضرت من بود بہ عمر قلیل

قبلہ او زد جرس الرحیل

گفت کسے ایں گہرِ شاہوار

در صدف حفظ امینے سپار

گفت سپردم بامینے کہ آں

گاہ نیارو بامانت زیاں

نیست مرا حاجت ابناء جنس
حافظ او خالق ہر جن و انس

''مولانا محبوب عالم ہادی فرماتے ہیں کہ ہمارے حضرت اس وقت کم عمر تھے جب آپ رحمۃ اللہ علیہ کے والد نے دنیا سے کوچ کیا۔ کسی نے کہا کہ اپنے اس گوہر شاہ سوار (فرزند) کو کسی نیک دیانت دار شخص کے حوالے کر دو۔ تو انھوں نے کہا میں نے اسے اس امانت دار کے سپرد کیا ہے جو امانت میں کسی قسم کی خیانت نہیں کرتا۔ مجھے لوگوں میں سے کسی کی حاجت نہیں، اس کا حافظ خود رب العالمین ہے۔''

آپ رحمۃ اللہ علیہ کے والد گرامی نے جس توکل اور بھروسہ سے آپ رحمۃ اللہ علیہ کو سپردِ خدا کیا تھا اللہ تعالیٰ نے ان کی لاج یوں رکھی کی کہ مولانا حافظ غلام مرتضیٰ کو ایک زمانے اور خطے کا مقتداء اور علم وعرفاں کا سرچشمہ فیض بنا دیا۔

تحصیل وتکمیل علم:

والدِ گرامی کی وفات کے بعد مولانا حافظ غلام مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ نے مختلف مراکز علوم وعرفاں کا سفر کیا۔ لیکن مکمل سیراب نہ ہو سکے باالاخر اپنے ایک استادِ گرامی کے مشورے سے تکمیل علوم ظاہری و باطنی کے لیے لِلٰہ شریف (تحصیل پنڈ وادنخان، ضلع جہلم) گئے اور وہاں مولانا غلام نبی للٰہی رحمۃ اللہ علیہ ۱۲۳۴۔۱۳۰۲ھ) جو کہ مولانا غلام محی الدین قصوری رحمۃ اللہ علیہ ۱۲۰۲۔۱۲۷۷ھ) کے اجل تلامذہ اور حفاظ میں سے تھے، سے ظاہری و باطنی علوم، حدیث، نحو، منطق، بدیع، فرائض اور اُصول وفروع کے تمام علوم میں کمال حاصل کیا۔ ان علوم کی تکمیل پر ۱۲۶۹ھ میں دستار فضیلت حاصل کی اور واپس اپنے گاؤں ''بیربل'' آ گئے۔ اس وقت آپ رحمۃ اللہ علیہ کی عمر صرف اٹھارہ برس تھی۔ (۷)

شرف بیعت:

دوران طالب علمی ہی میں مولانا حافظ غلام مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ اپنے استادگرامی مولانا غلام نبی للٰہی رحمۃ اللہ علیہ کی معیت میں آپ رحمۃ اللہ علیہ کے شیخ و مربی، مولانا غلام محی الدین قصوری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ ان کی باعمل شخصیت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ پہلی حاضری میں ہی ان کے ہاتھ پر شرفِ بیعت حاصل کر لیا۔ حضرت قصوری رحمۃ اللہ علیہ نے ابتدائی تلقین وتوجہ کے بعد مزید تربیت وتزکیہ کے لیے آپ رحمۃ اللہ علیہ کو

آپ کے استادگرامی حضرت للہی رحمۃ اللہ علیہ ہی کے سپرد کر دیا۔ حضرت للہی رحمۃ اللہ علیہ نے اس ہونہار طالب و سالک کو بہت جلد علم و عرفاں کی انتہائی بلندیوں کا سفر مکمل کروا کر بیک وقت سندِ فضیلت اور دستارِ خلافت سے نواز دیا۔ حضرت للہی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے گاؤں ''بیربل'' جا کر ایک مدرسہ و خانقاہ کے قیام کا حکم صادر فرمایا اور اپنے چند تلامذہ کو مولانا حافظ غلام مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ روانہ کیا تا کہ جاتے ہی درس و تدریس کا سلسلہ جاری ہو سکے۔ (۸)

درس وتدریس:

مولانا حافظ غلام مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ کو درس و تدریس کا بذاتِ خود بہت شوق تھا اور استادِ گرامی حضرت للہی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی حکم فرمایا تھا۔ اس لیے آپ نے ''بیربل'' واپس آتے ہی حضرت للہی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے عطا کردہ چند طلبہ سے درس و تدریس کا آغاز کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے آپ کے پاس طالبانِ علم و عرفاں کا اس قدر ہجوم ہو گیا کہ جامع مسجد بیربل میں باوجود وسعت کے تِل دھرنے کو جگہ نہ ملتی تھی۔ بڑے بڑے ذکی دور دور سے آپ رحمۃ اللہ علیہ کی شہرت سن کر آپ کے پاس زانوئے تلمذ تہہ کرنے آتے اور ظاہری و باطنی علوم سے سیراب ہو کر جاتے۔ دن رات درس و تدریس کا شغل جاری رہتا تھا۔ گویا کہ آپ کا مدرسہ و خانقاہ مولانا عبدالرحمٰن جامی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کا مصداق تھا۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ دعائیہ انداز میں فرماتے ہیں:

خوشا مسجد و مدرسہ و خانقاہیں
کہ دروے بود قیل و قالِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

مولانا حافظ غلام مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ نے خود فرمایا کہ ابتدا میں فقیر کو سوائے تدریس کے اور کوئی کام پسند نہ آتا تھا اور کسی دوسرے کام میں بالکل جی نہ لگتا تھا۔ حضرت مولانا محمد عمر بیربلوی لکھتے ہیں:

> ''درس کیا تھا ایک اقامتی یونیورسٹی (دارالعلوم) تھی جس کے تمام طلبا و اساتذہ دن رات مسجد میں مقیم رہتے۔ وہی درس گاہ تھی اور وہی دارالاقامت، گھر سے کھانا پک کر آتا تھا اور وہی مسجد ڈائننگ ہال (دسترخوان) بن جاتا تھا۔''(۹)

مرضِ وفات اور وصال:

مولانا عبدالرسول بکھروی لکھتے ہیں:

''آپ رحمۃ اللہ علیہ کو حسبِ مقتضائے حدیث مبارکہ (**اشد الناس بلاء الانبیاء، ثم الاولیاء، ثم الامثل**

فالامثل) کوئی نہ کوئی مرض لاحق رہتا۔ زندگی کے آخری ایام میں آپ کو فالج کا مرض لاحق ہوا جس کا اثر سال بھر یعنی ایام وفات تک رہا۔ دورانِ مرض آپ رحمۃ اللہ علیہ کا ایک پہلو بالکل بے حس وحرکت ہوگیا مگر کوئی نماز قضا نہ ہوئی حتیٰ کہ ہر نماز باجماعت ادا فرماتے تھے۔ عزیمت واستقامت اس قدر تھی کہ تیمم کی رخصت کے باوجود ہر نماز کے لیے وضو فرماتے۔ آخری ایام میں اسہال کی بیماری سے جسم انتہائی کمزور ہوگیا اس کے باوجود صوم و صلوۃ کی پابندی میں ذرہ برابر فرق نہ آیا حتیٰ کہ نماز تراویح بھی سہارے کے ساتھ باجماعت ادا کرتے رہے۔(۱۰)

بالآخر مرض کی شدت کی تاب نہ لاتے ہوئے ۱۵ /رجب المرجب ۱۳۲۱ھ بروز بدھ غروبِ آفتاب کے قریب آسمان علم ومعرفت کا آفتاب عالم تاب اور شریعت وطریقت کے اوج کا بدرِ منیر اس جہانِ فانی سے مخفی ہوکر واصلِ بارگاہِ قدس ہوگیا (اِناللہ و انّا اِلَیہ راجعون)۔ وفات سے اگلے دن جمعرات کو بعد از نمازِ ظہر حضرت صاجزادہ عبدالرسول للہی رحمۃ اللہ علیہ سجادہ نشین ''للہ شریف'' کی اقتداء میں ہزاروں لوگوں نے نمازِ جنازہ ادا کی اور بیربل شریف کے قبرستان میں آپ کو سپردِ خاک کیا گیا۔ جہاں آج بھی آپ کا مزار پر انوار موجود ہے۔(۱۱)

مشائخ واساتذہ:

مولانا حافظ غلام مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے زمانے کے نامور علماء اور صوفیاء سے اکتساب فیض کیا۔ اگرچہ آپ رحمۃ اللہ علیہ کے مشائخ واساتذہ کی تعداد کثیر ہے تاہم ان میں دو جلیل القدر شخصیات جن سے آپ نے ظاہری و باطنی علوم میں کمال حاصل کیا ان کا مختصر تعارف کچھ یوں ہے۔

۱۔ مولانا غلام محی الدین قصوری رحمۃ اللہ علیہ المعروف دائم الحضوری رحمۃ اللہ علیہ (۱۲۰۲۔۱۲۷۰ھ)

۲۔ مولانا غلام نبی للہی رحمۃ اللہ علیہ (۱۲۳۴۔۱۳۰۶ھ)

مولانا غلام محی الدین قصوری رحمۃ اللہ علیہ

مولانا غلام محی الدین قصوری رحمۃ اللہ علیہ ۱۲۰۲ھ بمطابق ۱۷۸۹ء کو قصور شہر میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد گرامی کا نام غلام مصطفیٰ تھا جو کہ مولانا حافظ غلام مرتضیٰ قصوری رحمۃ اللہ علیہ کے بیٹے تھے۔ مولانا حافظ غلام مرتضیٰ قصوری رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے عالم، مدرس اور صاحب سلوک وارشاد تھے۔ جو اپنے علمی اور روحانی کمالات کی وجہ سے ''مخدومِ پنجاب'' کے لقب سے مشہور تھے۔ پنجابی زبان اور میدانِ تصوف کے دو عظیم شاعر، سید عبداللہ

المعروف بلھے شاہ قصوری رحمۃ اللہ علیہ اور سید وارث شاہ رحمۃ اللہ علیہ انہی کے مکتبِ فیض سے کمال یافتہ تھے۔ مولانا غلام محی الدین قصوری رحمۃ اللہ علیہ کا نسب مختلف واسطوں سے ہوتا ہوا خلیفہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے۔(۱۲) آپ رحمۃ اللہ علیہ نے تمام عقلی ونقلی علوم اپنے چچا جان سے سیکھے۔ سلسلہ قادریہ میں اپنے چچا سے ہی بیعت کا شرف حاصل کیا۔ چچا کی وفات کے بعد حضرت شاہ غلام علی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (م۔ ۱۲۴۰ھ) کی خدمت میں دہلی حاضر ہو کر ان کے دست پر سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ کی بیعت کی اور کئی مہینے آپ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں رہ کر منازل سلوک و معرفت طے کیں۔ دہلی قیام کے دوران آپ رحمۃ اللہ علیہ محدث العصر، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (م۔ ۱۳۳۹ھ) علم حدیث کے لیے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور حدیث کی سند کا اعزاز حاصل کیا۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے علمی پیاس بجھانے کے بعد بڑی محبت اور خلوص سے تدریس کا اہم فریضہ انجام دیا۔ مولانا غلام محی الدین رحمۃ اللہ علیہ ایک جید عالم دین، محدث، فقیہ اور عظیم صوفی تھے۔ آپ عربی، فارسی اور پنجابی زبانوں میں بہت سی کتب کے مصنف اور شارح تھے۔ ان تینوں زبانوں میں آپ رحمۃ اللہ علیہ کو شعر گوئی کا بھی خاص ملکہ حاصل تھا۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کی چند ایک تصانیف درج ذیل ہیں:

۱۔ تحفہ رسولیہ (فارسی، نظم در معجزات سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

۲۔ دیوانِ حضوری (فارسی نظم)

۳۔ خطباتِ حضوریہ (عربی وفارسی نظم میں جمعہ کے خطبات)

۴۔ خلاصۃ التقریر فی مذمت مزامیر

۵۔ شرح بوستان (عربی)

۶۔ رسالہ سلالہ درردفرقہ ضالہ

۷۔ زادالحاج (پنجابی نظم میں مسائل سفر حج)

۸۔ رسالہ میراث

۹۔ رسالہ نظامیہ شریف درمسئلہ توحید

ان کے علاوہ متعدد کتب و رسائل امتداد زمانہ کے ہاتھوں ضائع ہو گئے۔ مولانا غلام محی الدین قصوری رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ۲۲ ذیقعد ۱۲۷۰ھ بمطابق ۱۸۵۵ء کو اس وقت ہوا جب آپ ''مثنوی مولانا روم'' کے درس میں اولیاء کرام کی موت اور ان کی برزخی حیات کو تفصیل سے بیان کرنے کے بعد مراقبہ کی حالت میں گردن جھکائے ہوئے تھے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کو قصور کے ایک بڑے قبرستان میں دفن کیا گیا جہاں آج بھی

آپ رحمۃ اللہ علیہ کا مزار مرجع خلائق ہے۔ (۱۳)

مولانا حافظ غلام نبی للہی رحمۃ اللہ علیہ

مولانا حافظ غلام نبی للہی رحمۃ اللہ علیہ کوہستان نمک اور دریائے جہلم کے درمیان واقع تحصیل پنڈ دادنخان کے مشہور قصبہ ''للہ'' میں جمعرات کی شب ۱۲۳۴ھ بمطابق ۱۸۱۹ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق اعوان خاندان کی ذیلی شاخ ''سنارہا'' سے تھا۔ جو آپ رحمۃ اللہ علیہ کے آباؤ اجداد میں سے ایک بزرگ ثناء اللہ کے نام کی نسبت سے مشہور ہوئی۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کے والدِ گرامی کا نام قاضی حسن دین تھا جو اپنے وقت کے بلند پایہ عالم دین اور صاحبِ تقویٰ صوفی تھے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے علوم ظاہری کی ابتداء اپنے والدِ گرامی سے کی اور کئی کتب پر عبور حاصل کیا۔ بعد ازاں ضلع چکوال کے علاقہ ''دھن'' کے ایک گاؤں اوڈھرال میں مولانا حافظ سردار محمد رحمۃ اللہ علیہ کے پاس حاضر ہو کر معقولات کی تکمیل کی۔ اس کے بعد پشاور میں مولانا محمد عظیمؒ، مفتی محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ اور حافظ دراز صاحبان جیسے نامور علماء سے علوم ومعارف کے خزانے سمیٹے۔ (۱۴)

مولانا حافظ غلام نبی للہی رحمۃ اللہ علیہ کے اساتذہ آپ رحمۃ اللہ علیہ کے علم وفضل اس قدر متاثر اور معترف تھے کہ آپ رحمۃ اللہ علیہ کو پشاور کے اسی دارالعلوم میں تدریس کی ذمہ داریاں سونپ دیں جہاں آپ رحمۃ اللہ علیہ خود پڑھا کرتے تھے۔ بعد ازاں اپنے والدِ گرامی کے حکم پر اپنے گاؤں ''للہ'' واپس آ کر درس وتدریس کے وسیع سلسلہ کو جاری کیا اور وہاں کثیر لوگوں نے آپ رحمۃ اللہ علیہ سے استفادہ کیا۔ مولانا غلام نبی للہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دور کے عظیم بزرگ، مولانا غلام محی الدین قصوری رحمۃ اللہ علیہ کے دست حق پرست پر بیعت کی اور کمالات باطنی سے فیض یاب ہوئے۔

مولانا حافظ غلام نبی للہی رحمۃ اللہ علیہ نے قبل از وفات کنایۃً اپنے سفر آخرت کی خبر دے دی۔ بروز اتوار ۲۱ ربیع الاول ۱۳۰۶ھ بوقت دو پہر حسبِ معمول قیلولہ کیا۔ بیدار ہونے کے بعد خود مسواک کرنے لگے اور مؤذن کو جلد اذان دینے کا کہا اور ساتھ ساتھ خود بھی کلماتِ اذان دہراتے رہے۔ جب مؤذن ''اشھد ان لا الہ الا اللہ'' پر پہنچا تو یہ کلماتِ مولانا خود بھی دہراتے ہوئے فرش مسجد پر جھک گئے اور جان، جانِ آفرین کے سپرد کر دی۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کی نمازِ جنازہ کی امامت آپ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد، خلیفہ اعظم اور مقرب خاص مولانا حافظ غلام مرتضیٰ بیربلوی رحمۃ اللہ علیہ نے کرائی اور للہ ہی میں آپ رحمۃ اللہ علیہ کو دفن کیا گیا۔ (۱۵)

آپ رحمۃ اللہ علیہ نے ذکرِ بالجہر اور آداب مسجد کے باب میں ایک رسالہ ''القول القوی'' کے نام سے تصنیف

فرمایا۔ علمی کتب پر حواشی اور تقاریظ لکھیں اور کئی فتاویٰ اور بلند پایہ مکتوبات بھی آپ رحمۃ اللہ علیہ کا علمی ورثہ ہیں۔

مولانا حافظ غلام مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ خُلفاء:

عوام الناس کی ایک کثیر تعداد میں فیض یابی کے ساتھ ساتھ آپ رحمۃ اللہ علیہ سے علمی وروحانی استفادہ کرنے والوں میں جلیل القدر علماء، ادباء، شعراء اور مشائخ بھی شامل ہیں۔ جن میں سے حضرت مولانا محبوب عالم سوہاویؒ، حضرت قاضی غلام محمد شاہ پوری، حضرت پیر سلطان سکندر شاہ خوشابی، حضرت قاضی عطا محمد نلوی، حضرت میاں اللہ دین خوشابی، حضرت مفتی شاہ عالم بیربلوی، حضرت مولانا شمس الدین سیہروی، حضرت مولانا نانورالدین دہالوی، حضرت قاری اللہ بخش فیض پوری اور حضرت صوفی محمد ابراہیم قصوری کے علاوہ سرہند کے سجادہ نشین حضرت صاحب زادہ سید احمد حسن اور قصور کے سجادہ نشین حضرت پیر سید محمد شاہ قصوری قابل ذکر ہیں۔

مولانا حافظ غلام مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد:

مولانا حافظ غلام مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ کے تین بیٹے، مولانا حافظ احمد سعید، مولانا حافظ محمد سعید اور مولانا حافظ ابوسعید المعروف غلام رسول رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ انہوں نے اپنے والدِ گرامی نقش قدم پر چلتے ہوئے تعلیم وتعلم اور دعوت ارشاد کا سلسلہ جاری رکھا۔ تشنگانِ علم دور ونزدیک سے آتے اور سیراب ہوکر واپس جاتے۔ یہ درس وتدریس کا سلسلہ آج بھی خانقاہ مرتضویہ بیربل شریف میں، مولانا حافظ غلام مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ کی چوتھی پشت سے ''حضرت صاجزادہ پروفیسر محبوب حسین چشتی'' کی شب وروز محنت شاقہ سے عقلی ونقلی علوم کی عظیم اسلامک یونیورسٹی ''ادارۂ معین الاسلام بیربل شریف، سرگودھا'' کی شکل میں جاری وساری ہے جس میں جدید وقدیم علوم کا حسین امتزاج ہے۔

کتب خانہ:

مولانا حافظ غلام مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک گراں قدر اور عظیم الشان ذاتی کتب خانہ قائم کیا۔ جس میں بلند پایہ نایاب ونادر علمی کتب کا ایک وسیع ذخیرہ تھا۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کو جب بھی کسی نایاب کتاب سے متعلق علم ہوتا، حاصل کرکے کتب خانہ کی زینت بنالیتے۔ اگر اصل کتاب نہ ملتی تو کسی سے عاریۃً لے کر اس کی نقل کروا لیتے۔ کتابوں سے اس قدر شغف تھا کہ جو کچھ مال پاس آتا کتب کی خرید پر صرف کردیتے۔ آپ کتابوں کی خرید سے بڑھ کر دنیا کی کسی منفعت کو ترجیح نہ دیتے۔ ایک دفعہ کسی شخص نے عرض کی کہ آپ کے دادا کی ملکیت

والی زمین اور اس کے ساتھ والا کنواں ایک سو روپیہ خرچ کرنے سے آپ کو مل سکتا ہے تو آپ رحمۃ اللہ علیہ نے جواباً فرمایا: ''اگر ایک سو روپیہ پاس ہوا تو کتابیں خرید لیں گے یا اللہ کی راہ میں خرچ کر دیں گے ہمیں کنوؤں کی کیا ضرورت ہے۔''(۱۶)

آپ رحمۃ اللہ علیہ کتب خریدتے، مطالعہ کرتے اور مطالعہ کے بعد اکثر کتب پر یہ شعر لکھ دیا کرتے تھے:

جمادے چند دادیم جاں خریدیم

بحمد اللہ عجب ارزاں خریدیم(۱۷)

''ہم نے چند ٹھیکریاں (سکے) ادا کیے اور روح زندگی (کتب) خرید لیں۔ الحمد اللہ ہم نے کیا خوب سستا سودا خریدا ہے۔''

آپ رحمۃ اللہ علیہ کا کتب خانہ کیا تھا علوم وفنون کے جواہر پاروں کا مرقع ومرصع دار الکتب تھا۔ ہر فن کی بیسیوں کتب تھیں اور اکثر پر مولانا حافظ غلام مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ کے اپنے تحریر کردہ حواشی موجود تھے۔ لیکن افسوس! کہ یہ عظیم کتب خانہ آپ کے وصال کے بعد اپنی آب وتاب برقرار نہ رکھ سکا۔ کچھ عرصہ تک تو آپ رحمۃ اللہ علیہ کے صاجزادگان کے علمی ذوق اور رونق کی وجہ سے اس کا بھرم برقرار رہا لیکن بعد ازاں تقسیم در تقسیم نے اس کی افادیت ومرکزیت کو ختم کر دیا۔ دوسرا یہ کہ دریائے جہلم کے کنارے آباد بیربل کی بستی وقتاً فوقتاً سیلاب کی تباہ کاریوں کا نشانہ بنتی رہی جس کی وجہ سے آپ رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد کے پاس یہ منقسم کتب خانہ بھی محفوظ نہ رہ سکا۔ مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے بے شمار کتب کو دیمک نے خستہ حال کر دیا اور بالآخر وہ ضائع ہوگئیں۔ تاہم آپ رحمۃ اللہ علیہ کے قلمی نسخہ جات پر آپ کی چوتھی پشت میں سے صاجزادہ پروفیسر محبوب حسین چشتی کام کروا رہے ہیں اور اس عظیم علمی سرمایہ کو اشاعت کے بعد عوام الناس تک پہنچانے کی بھرپور کوشش کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی سعی جمیلہ کو قبول فرمائے اور مولانا حافظ غلام مرتضیٰ کے علمی سرمایہ سے تشنگانِ علم مستفید ہوں۔ (آمین)

کتب تفسیر کا تعارف وتبصرہ

تفسیر سورۃ الھکم التکاثر:

یہ تفسیر مولانا حافظ مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مخطوط ہے جو ابھی تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوا۔ مؤلف کی طرف اس کی نسبت درج ذیل شواہد کی بنا پر درست قرار دی جاسکتی ہے۔

خود مؤلف نے کتاب کے مختصر مقدمہ میں اس کی نسبت ان الفاظ میں اپنی طرف بیان کی ہے۔

(فھذہ تذکرۃ وافیۃ وحسنۃ باقیۃ من احقر الوری تراب اقدام الاولیا غلام مرتضی نوّر اللہ قلبہ بنور الصدق والصفا والفتھامن۔۔) (۱۸)

مولانا عبدالرسول بکھروی رحمۃ اللہ علیہ نے ''انور مرتضوی'' میں آپ رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف کی فہرست میں اس کو ذکر کیا ہے۔

پروفیسر محمد نصر اللہ معینی نے اپنی تالیف 'عرفان مرتضوی'' آپ رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف کی فہرست میں اس کا ذکر کیا ہے۔

سہ ماہی مجلہ معین الاسلام بیربل ضلع سرگودھا کے کئی شماروں میں بھی اس کا ذکر آپ رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے ملتا ہے۔

مخطوط کی کیفیت اور اہم خصائل:

اس مخطوط کا ایک ہی نسخہ دستیاب ہوا ہے جو کہ ایک چھوٹے سائز کے رجسٹر کی صورت میں موجود ہے۔
یہ مخطوط مکتبہ مرتضویہ، ادارہ معین الاسلام بیربل، ضلع سرگودھا میں قابلِ قرات درست حالت میں موجود ہے۔

اگرچہ یہ مخطوط قابلِ قرات ہے لیکن اس کے بعض صفحات امتدادِ زمانہ اور دیکھ بال نہ ہونے کی وجہ سے کسی قدر بوسیدہ ہو چکے ہیں۔تاہم یہ مخطوط اپنے تمام تر محتویات کے ساتھ محفوظ ہے۔

یہ مخطوط (۲۰۰) دوسو صفحات پر مشتمل ہے۔

مخطوط کی عبارت خط نسخ میں ہے اور موجودہ نسخے کے ناسخ (کاتب) مولانا محبوب عالم سوہاوی رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے، مولانا عبداللطیف سوہاوی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔

مخطوط کی عبارت مسلسل چلتی ہے اس میں پیراگراف اور بند نہیں ہیں۔مخطوط کے صفحات کا سائز ۲۵ سم لمبا اور ۱۶ سم چوڑا ہے۔مختلف صفحات میں سطروں کی تعداد (۱۰، ۱۳، ۱۵) مختلف ہے۔

آغاز مخطوط:

مخطوط کے آغاز میں چند تمہیدی کلمات ہیں جنہیں مختصر دیباچہ کہا جاسکتا ہے۔موضوع سے متعلق اصل عبارت کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے:

(الحمد اللہ الّذی خلق الانسان، علمہ البیان، والصلوۃ والسلام علی سید

الانس و الجان وعلی اله واصحابه الذین بذلوا هممهم فی معانی القرآن۔۔۔)(۱۹)

وسط مخطوط:

یہ مخطوط چوں کہ دوسو صفحات پر مشتمل ہے لہٰذا اس کے وسطی صفحہ نمبر ۱۰۱ پر ایک موضوع کی تکمیل ان الفاظ سے کی گئی ہے۔

"طوبی لهذا العبد الذی لم یذنب قط، ماا کرم الله (فاولئک یبدل الله سیاتهم حسنات)"(۲۰)

اختتام مخطوط:

مؤلف رحمۃ اللہ علیہ نے مخطوط کا اختتام ان الفاظ میں کیا ہے:

"واصحابه اجمعین برحمتک یاارحم الراحمین"

مخطوط کی عبارت مکمل ہونے پر ناسخ (کاتب) نے اپنی طرف سے ان کلمات کا اضافہ کیا ہے:

"قدتمت هذا التصنیف من ید عبد الضعیف المعروف بمحمد عبداللطیف جعل الله علمه وعمله فی التضعیف"(۲۱)

منہج واسلوب:

مولانا حافظ غلام مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ کے مخطوط "تفسیر سورۃ الھکم التکاثر" کا جائزہ لینے سے یہ بات واضح ہوئی کہ مؤلف نے اس کتاب کا آغاز ایک مختصر دیباچے یا مقدمے سے کیا جس میں اس کتاب کا مختصر تعارف کروایا اور اسی کے اندر اس تفسیر کی نسبت اپنی طرف کی ہے۔آپ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا نام انتہائی انکسار سے تحریر کیا ہے۔

سورۃ التکاثر کی تفسیر سے قبل آپ رحمۃ اللہ علیہ نے سورۃ کا مختصر تعارف کرایا ہے اور اس سورۃ سے متعلق وارد روایات کا ذکر کیا ہے۔

مؤلف نے سورۃ کے مختلف الفاظ وتراکیب کی لغوی و اصلاحی تشریح بھی کی ہے اور ان الفاظ کی توضیحات بھی درج کی ہیں۔

مؤلف نے تفسیر کے دوران بعض مقامات پر موضوع سے متعلق اشعار بھی نقل کیے ہیں۔

نقد وتبصرہ:

زیرِ بحث مخطوط ''تفسیر سورۃ الھکم التکاثر'' اپنے موضوع کے اعتبار سے انفرادیت کی حامل تفسیر ہے کیونکہ عمومی طور پر مختصر سورتوں کی الگ تفسیری کتب کی تعداد بہت کم ہے۔ 'پھر' تکاثر'' جیسا موضوع فی زمانہ انسان کے حبِ دنیا اور جاہ و مال کی حرص وطلب کے حوالے سے نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ جس سے اجتناب کی تلقین کرتے ہوئے مؤلف نے اس موضوع کا انتخاب کیا۔

کتاب اگرچہ آیاتِ قرآنی، احادیث نبویہ آثار و اقوال صحابہ، تفسیری روایات اور مؤلف کی ذاتی تشریحات کی بناء پر موضوع سے متعلق معلومات کا ایک گراں قدر سرمایہ ہے۔ تاہم ترتیب کے اعتبار سے اس میں درج ذیل چند خامیوں کی نشاندہی کی جاتی ہے۔

کتاب بغیر فہرست عنوانات کے تحت لکھی گئی ہے۔

عبارت کی تحریر مسلسل ہے یعنی پیراگراف یا بند نہیں بنائے گئے۔

مختلف مقامات پر تفسیر میں غیر ضروری طوالت ہے۔ جو اصل موضوع کو نظروں سے اوجھل کر دیتی ہے۔

المختصر یہ کتاب اپنے موضوع، مواد اور موعظت و نصیحت کے اعتبار سے انفرادیت کی حامل ہے۔ موضوع اس قدر اہم ہے کہ حسن ترتیب سے تدوین کے بعد شائع ہونی چاہیے تاکہ آج کے دور میں پائی جانے والی حرص وطمع کی لعنت سے چھٹکارا پانے میں مؤلف کی یہ کاوش معاون ثابت ہوسکے۔

کتاب المعراج

مولانا حافظ غلام مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ ایک نہایت اہم اور تفسیری ادب میں عظیم شاہکار ''کتاب المعراج'' ہے۔ اپنے موضوع کے اعتبار سے یہ تصنیف عقلی ونقلی علوم کا ایک خزانہ ہے۔ مؤلف نے اس کتاب کا آغاز بغیر مقدمے کے کیا ہے۔ بذات خود صراحتاً اپنی طرف نسبت نہیں کی تاہم آپ رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات، متعلقین وتلامذہ کے مکتوبات میں اس کتاب کا ذکر مؤلف کے حوالے سے کیا گیا ہے۔

مخطوط کی کیفیت اور خصائص:

مخطوط ''کتاب المعراج''، مولانا حافظ غلام مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ کا ایک گراں قدر، نادر علمی سرمایہ ہے جو ابھی تک زیور طباعت سے مزین نہیں ہوسکا۔ اس کتاب کے تاحال دو نسخے دریافت ہوئے ہیں۔ دو قلمی نسخے لاہور

کی مشہور لائبریری، دیال سنگھ (ٹرسٹ) میں موجود ہیں۔ جن کا اندراج لائبریری کی فہرست مخطوطات میں سیریل نمبر ۴۰۶ اور ۴۳۴ پر ہے۔ جب کہ دو قلمی نسخے مؤلف کے شیخ و مربی اور استاد مولانا حافظ غلام نبی للہی رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ للہ ضلع جہلم کی لائبریری میں موجود ہیں۔ مخطوط کے چند ایک خصائص درج ذیل ہیں۔

یہ مخطوط ۴۴۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ ہر صفحہ میں گیارہ (۱۱) سطریں اور ہر سطر میں تقریباً بارہ (۱۲) الفاظ ہیں۔ مخطوط کا پیپر سائز ۲۴ سم لمبا اور ۱۵ سم چوڑا ہے۔

مخطوط ''خط نسخ'' میں تحریر کیا گیا ہے۔ ابتدا سے انتہا تک رسم الخط ایک جیسا ہے اور آغاز سے اختتام تک سیاہ روشنائی استعمال کی گئی ہے۔

مکمل مخطوط بغیر اعراب کے ہے۔ بعض مقامات پر حذف وسقط بھی واقع ہے۔

مخطوط کی عبارت مسلسل ہے پیرگراف نہیں بنائے گئے۔

مخطوط کے اختتام پر کاتب کا نام ''سراج الدین'' درج ہے اور ساتھ ہی تاریخ فراغت ۲۶ ربیع الاول ۱۳۲۶ھ بمطابق ۲۸/اپریل ۱۹۰۸ء رقم کی گئی ہے۔

آغازِ مخطوط:

مخطوط کی عبارت کا آغاز مولانا حافظ غلام مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ نے بغیر کسی مقدمہ کے ان الفاظ سے اصل موضوع سے کیا ہے:

''(سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا) انما قال سبحان، تنزیھا لذاتہ من کل مایلیق بجلالہ من القبائح و النقائص''[۲۲]

اختتامِ مخطوط:

مخطوط ''کتاب المعراج'' اختتامِ مضمون کی عبارت کے تسلسل کے ساتھ مؤلف نے اچانک کر دیا ہے۔ اتمام کتاب سے متعلق کسی قسم کا کوئی بیان شامل نہیں کیا۔ مخطوط کا اختتام مؤلف نے ان کلمات پر کیا ہے:

''الخامسۃ عشر، انہ لما رفع بعیسیٰ علیہ السلام الی السماء و بقی ھناک و نبیا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لما اسریٰ بہ الی السمٰوات ارسل بعد ذلک الی امتہ فی الارض فما الحکمۃ فی ذلک''[۲۳]

مخطوط ''کتاب المعراج'' کا منہج واسلوب:

مولانا حافظ غلام مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ کا شمار دورِ آخر کے اجل علماء اور عظیم صوفیا میں ہوتا ہے آپ رحمۃ اللہ علیہ نے آج سے تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل درس وتدریس، سلوک وارشاد، وعظ وتبلیغ اور تصنیف وتالیف کا اہم کار سرانجام دیا۔ واقعہ معراج چوں کہ انسان کی جسمانی اور روحانی عظمتوں اور رفعتوں کا مظہر ہے اس لیے مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے طبعی رجحان کے باعث اس موضوع پر قلم اُٹھایا اور اس کا حق ادا کر دیا۔

درج ذیل نکات سے بہ آسانی مخطوط ''کتاب المعراج'' کے منہج واسلوب اور خصائص کو سمجھا جا سکتا ہے۔

مؤلف نے آیات کی تشریح میں قرآن وحدیث اور اقوال وآثار کا استعمال کیا ہے جیسے سورۃ بنی اسرائیل کی پہلی ہی آیت میں کلمہ ''عبد'' کے متعلق قرآن وحدیث اور اقوال وآثار سے دلائل دے کر یہ ثابت کیا ہے کہ معراج صرف روحانی نہیں بلکہ جسمانی بھی تھا۔

پھر تعددِ معراج پر بحث کی ہے اور اس پر وارد اعتراضات کے شافی جواب دیے ہیں۔

اس کے بعد مؤلف نے سفرِ معراج کے لیے تخصیصِ شب کی حکمت بیان کرتے ہوئے بہت سے اسرار ورموز بیان کیے ہیں۔

مزید برآں آپ رحمۃ اللہ علیہ نے سفرِ اسرا کی حکمتیں بیان کی ہیں اور اس پر بیس (۲۰) کے قریب دلائل پیش کیے ہیں۔

مؤلف نے مختصر وقت میں سفرِ معراج کے مکمل ہونے پر وارد ہونے والے اعتراضات کا تمثیلی انداز میں جواب دیا ہے۔ اسی طرح معراج (اسراء) کی تاریخ کے تعین پر دلائل سے اپنا مؤقف ثابت کیا ہے کہ یہ واقعہ یقینی طور پر رجب کی (۲۷) تاریخ کو ہی پیش آیا تھا۔

- ☆ اس کے بعد مؤلف نے شبِ معراج آسمانوں اور زمین کی تزئین وآرائش، ملاء اعلیٰ میں فرشتوں کی طرف سے استقبال وغیرہ سے متعلق روایات کا بالتفصیل ذکر کیا ہے۔
- ☆ عروج الی السماء، ساتوں آسمانوں پر مختلف انبیاء سے ملاقاتیں اور فرشتوں کی عبادت کی کیفیات پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔
- ☆ مؤلف نے اس مخطوط کی تالیف میں آیات کی لغت کے اعتبار سے انتہائی بہترین تفسیر کی ہے۔ ساتھ

ہی ساتھ حق تعالیٰ کی مختلف کلمات کے استعمال کی لغت اور فقہ کے اعتبار سے حکمتیں بیان کی ہیں۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ خصوصی تعلق انتہائی دلنشین انداز میں ذکر کیا گیا ہے۔ کلمہ ''عبد'' کی قرآنی آیات، احادیث اور آثار واقوال کی روشنی میں توضیح کی ہے۔ اس ضمن میں حضرت موسیٰؑ کا اپنے رب کے حضور اپنی عبودیت کا اعتراف، اس پر قول نقل کیا ہے۔ ساتھ ہی معراج کی رات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اللہ تعالیٰ کے حضور عجز و نیاز اور بندگی کا تذکرہ انتہائی دلکش انداز سے پیش کیا ہے کہ بارگاہ قدس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے آپ کو ''عبد'' کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں لیکن مخلوق اور امت کے لیے اللہ تعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ''صاحب اوصاف وکمالاتِ رسول'' کے لقب سے ذکر کرتا ہے المختصر آپ رحمۃ اللہ علیہ کے اس مخطوط میں سورۃ بنی اسرائیل کی پہلی آیت کا مطالعہ کرنے سے ہی اس کا منہج واسلوب واضح ہو جاتا ہے کہ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے کس قدر دلکش اور عمدہ انداز میں اس تفسیری مخطوط کو قرآنی آیات واحادیث، آثار واقوال اور حکایات وروایات کے بیان سے مزین کیا ہے۔ (۲۴)

نقد وتبصرہ:

مخطوط ''کتاب المعراج'' اپنے موضوع کے اعتبار سے انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ معراج النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسے عظیم معجزہ کا بیان عقیدت ومحبت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی علامت ہے۔ مولانا حافظ غلام مرتضیٰ بیربلوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس موضوع سے اپنی محبت وعقیدت کی بناء پر یہ مخطوط تحریر فرمایا۔ آج کے الحاد ودہریت اور فلسفہ وتعقل کے پرآشوب دور میں ایسی کتب یقیناً ایمان کی تقویت کا باعث ہیں۔ مؤلف رحمۃ اللہ علیہ نے انتہائی دلکش اسلوب، تحقیقی انداز اور روایتی تفصیلات کے ساتھ موضوع کا حق ادا کیا ہے جس کی بدولت آپ رحمۃ اللہ علیہ کی یہ کتاب ''معراج النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' پر لکھی جانے والی تمام کتب سے فوقیت رکھتی ہے۔ مؤلف رحمۃ اللہ علیہ اگرچہ اہلِ عرب سے نہ تھے تاہم آپ کی تحریر کی سلاست اور انداز بیان کی چاشنی نے اس کتاب کو ایک ایسے گلدستہ عقیدت کی شکل دے دی ہے جس سے ایک زمانہ اپنے مشام جاں کو معطر کرتا رہے گا۔

تاہم انسانی تالیف ہونے کی بناء پر اس کتاب میں بھی چند ایک ایسے پہلو بھی ہیں جن پر اگر توجہ دی جاتی تو یہ کتاب مزید عمدہ دکھائی دیتی۔

کتاب کا مقدمہ اور دیباچہ سرے سے موجود ہی نہیں جو کہ کتاب کا جزو لازم ہوتا ہے کیونکہ اس میں وجہ انتخاب موضوع غرض وغایت اور اہمیتِ موضوع کا ذکر ہوتا ہے۔ اس مخطوط میں مقدمہ کا نہ ہونا بڑی

تشنگی کا احساس دلاتا ہے۔

فصول اور ابواب بندی کا اہتمام نہیں کیا گیا جس کی وجہ سے کتاب کے حسن میں قدرے کمی ہے۔

عبارت بند اور پیرا گراف کے بغیر مسلسل چلتی ہے جو کہ حسن تحریر کی ایک بہت بڑی خامی ہے۔

کتاب کو عقلی و نقلی دلائل سے مزین تو کیا گیا ہے لیکن طرزِ تحریر قدیم ہے۔ حوالہ جات وغیرہ کا سرے سے ذکر نہیں کیا گیا۔

کتاب کو مختلف موضوعات اور عنوانات کے تحت بیان کیا جاتا تو قاری کے لیے زیادہ مفید ہو سکتی تھی۔

المختصر یہ کتاب اپنے موضوع اور مواد کے اعتبار سے ان تمام اعتراضات کا جواب ہے جو عقل پسندوں اور معترضین کی طرف سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس عظیم علمی سرمایہ کے ضخیم مجموعہ کو اردو ترجمہ کے ساتھ شائع کیا جائے تا کہ مؤلف کی اس کاوش سے ہر سطح کے قارئین مستفید ہو سکیں۔

کتب حدیث کا تعارف وتبصرہ

۱۔ مصباح الدجیٰ فی شرح احادیث المصطفیٰ

۲۔ تحفۃ الطلبۃ ترجمہ مصباح الدجیٰ

''تحفۃ الطلبۃ'' چوں کہ کتاب ''مصباح الدجیٰ فی شرح احادیث المصطفیٰ'' کا اردو ترجمہ ہے اور اصل کتاب عربی میں لکھی گئی ہے لہٰذا دونوں کتب کا تعارف وتبصرہ اکٹھے ہی پیش کیا جائے گا۔

مختلف شواہد اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ دونوں مخطوطات مولانا حافظ غلام مرتضیٰ بیربلوی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ چند ایک درج ذیل ہیں:

☆ مؤلف نے خود ''تحفۃ الطلبہ'' کے مقدمے میں اس کی نسبت اپنی طرف کی ہے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

> ''عرض کرتا ہے فقیر، حقیر پر تقصیر، احقر الوریٰ غلام مرتضیٰ رزقہ اللہ الصدق والصفاء کہ کتاب ''مشارق الانوار'' علم حدیث میں نہایت عمدہ کتاب ہے۔ اس واسطے کہ اس کی احادیث صحت پر اتفاق ہے۔ اس کا نام ''مصباح الدجیٰ'' اور ترجمہ کا نام ''تحفۃ الطلبۃ'' مقرر کیا گیا ہے۔ حق تعالیٰ اپنے کرم سے اس کتاب کو مقبول کرے اور اہلِ اسلام کو فائدہ عام بخشے اور بھول چوک معاف کرے۔''(۲۵)

☆ مخطوط کے بعض اوراق پر مؤلف کی ذاتی مہر بھی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ مؤلف کی اپنی تحریر کردہ ہے۔

☆ اختتامی کلمات میں بھی مؤلف نے اس مخطوط کو اپنی طرف منسوب کرتے ہوئے یوں لکھا ہے:

"الحمد للہ یہ کتاب "تحفة الطلبة ترجمه مصباح الدجی" از دست فقیر حقیر پر تقصیر، احقر الوریٰ غلام مرتضیٰ رزقہ اللہ الصدق و الصفا در روز دوشنبہ ماہِ ربیع الآخر ۱۲۷۰ھ وقتِ عصر تمام کردن۔"(۲۶)

درج بالا شواہد سے معلوم ہوا کہ یہ مخطوط حقیقتاً مولانا حافظ غلام مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ کی تالیفات میں سے ہیں۔

کیفیت مخطوط اور خصائص:

مولانا حافظ غلام مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ کی تالیف "تحفۃ الطلبہ اردو ترجمہ مصباح الدجی فی شرح احادیث المصطفیٰ" کا مخطوط مکتبہ مرتضویہ ادارہ معین الاسلام، بیربل سرگودھا میں موجود ہے ابھی تک اس کا یہ ایک ہی نسخہ دریافت ہوا ہے۔ مخطوط کے چند خصائص درج ذیل ہیں:

مخطوط کے تمام اوراق پڑھے جانے کے قابل ہیں۔ البتہ چند ایک مقامات پر بعض الفاظ اور کلمات کے پڑھنے میں، اوراق کی بوسیدگی یا تحریر کا انداز قدرے دشوار ہونے کی وجہ سے دقت پیش آتی ہے۔

مخطوط کے کل صفحات ایک سو بارہ (۱۱۲) ہیں۔ ہر صفحہ پر پندرہ سطریں تحریر ہیں اور ہر سطر میں تقریباً سولہ (۱۶) الفاظ ہیں۔ صفحات کی لمبائی ۲۲.۵ اور چوڑائی ۱۵ ر سم ہے۔ مخطوط مؤلف کا بقلم خود تحریر کردہ ہے۔

مخطوط کا رسم الخط آغاز سے اختتام تک فارسی اور نستعلیق ہے۔ کتابت کے لیے سیاہ اور سرخ روشنائی استعمال کی گئی ہے۔ بین السطور اور حاشیہ میں بعض مشکل عربی و فارسی الفاظ کے اردو معانی بھی تحریر کیے گئے ہیں۔

مولانا حافظ غلام مرتضیٰؒ نے مخطوط کا آغاز ان الفاظ سے کیا ہے:

"الحمد للہ رب العالمین و الصلوٰۃ و السلام علی محمد سید المرسلین و شفیع المذنبین و علی آلہ و صحبہ اجمعین۔"

مخطوط کا اختتام ان الفاظ پر کیا ہے:

"الحمد للہ علی الاتمام و الصلوة علی رسوله محمد و أله و صحبه الکرام۔"(۲۷)

مولانا حافظ غلام مرتضیٰ نے آخر میں کتاب کی اہمیت سے متعلق ایک مثنوی تحریر کی ہے جس کے چند اشعار یہ ہیں:

شکر کہ انجام کو پہنچی کتاب
علم حدیث کی لب لباب
جو کہ مطالب تھے بر اوجِ فلک
ترجمے سے آئے اتر ارض تک
یعنی کہ اردو کی پہن کر قبا
شاہد تازی ہوا جلوہ نما
دوستو! اب اس کا ادا حق کرو
خلق کو سمجھاؤ خود اس کو پڑھو
یا رب ان اوراق کو مقبول کر
ہند کو اس فیض سے کر بہرہ ور
یا رب اس عاجز کی دعا کر قبول
خاتمہ بالخیر بحق رسول(۲۸)

تاریخ تکمیل مخطوط:

مؤلف نے مخطوط کے اختتام پر تاریخ تکمیل کتاب خود تحریر کی ہے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

الحمدللہ کہ کتاب ''تحفۃ الطلبۃ ترجمۃ مصباح الدجی'' از دست فقیر، حقیر، پر تقصیر، احقرالوریٰ غلام مرتضیٰ رزقہ اللہ الصدق و الصفا، در روز دو شنبہ بارہ ربیع الآخر ۱۲۷۰ھ وقتِ عصر تمام کردن۔(۲۹)

مخطوط کا منہج واسلوب:

مولانا حافظ غلام مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مخطوط احادیث صحیحہ کی روشنی میں عام مسلمانوں کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ اسی لیے انہوں نے صحیحین میں سے ان احادیث کا انتخاب کیا ہے جن کا ایک مسلمان کی روزمرہ زندگی میں بڑا دخل ہے۔ کتاب کا آغاز ایک مختصر مگر جامع مقدمے سے کیا ہے جس میں کتاب کے نام، موضوع اور

سببِ تالیف کو بیان کیا ہے اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ذکر کیا ہے کہ مؤلف نے یہ کتاب ''مشارق الانوار'' میں بیان کردہ روایات کی اہمیت کے پیش نظر تالیف کی ہے۔ کتاب کے آغاز میں اصول حدیث کے ضمن میں انتہائی مفید اور جامع انداز میں اصطلاحات حدیث کی وضاحت کی ہے تاکہ قاری کے لیے حدیث کی حیثیت کو پرکھنے میں آسانی ہو۔ مخطوط میں مؤلف رحمۃ اللہ علیہ نے درج ذیل اہم موضوعات کو احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روشنی میں بیان کیا ہے:

۱۔ ایمان ۲۔ علم ۳۔ فضائل وضو ومسواک ۴۔ نماز ۵۔ عیادتِ مریض ۶۔ تقدیر

۷۔ مردوں کے احکام ۸۔ فضائلِ رمضان

۹۔ حج ۱۰۔ فضائل سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ۱۱۔ مناقب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

مؤلف نے اس کتاب میں پندرہ (۱۵) ابواب بنائے ہیں پھر مختلف ابواب کی مزید فصول بنائی ہیں۔ موضوعات سے متعلق صحیحین کی ان روایات کو بیان کیا ہے جو معروف ہیں۔ مؤلف رحمۃ اللہ علیہ بخاری و مسلم کی روایت نقل کرنے کے بعد اس کا ترجمہ مولوی خرم علی کی کتاب ''تحفہ الاخیار فی ترجمۃ مشارق الانورا'' سے تحریر کرتے ہیں۔ حدیث کے اختتام پر شرح حدیث اور ذاتی رائے کا اظہار ''فائدہ'' کے عنوان سے تحریر کرتے ہیں۔ فائدہ میں فارسی اور اُردو اشعار کا استعمال کرتے ہیں لیکن شاعر کا حوالہ نہیں دیتے۔ جہاں موضوع کی مناسبت ہو وہاں معاشرتی بگاڑ اور عصری تقاضوں کو شریعت کی روشنی میں مختصراً بیان کرتے ہیں۔

الغرض مؤلف نے نہایت محنت، باریک بینی اور فکر ونظر سے اس کتاب کی تالیف کی ہے اور اس کتاب کو اپنے موضوعات کے اعتبار سے نہ صرف طلبہ بلکہ عام قاری کے لیے بھی حقیقی معنوں میں ایک ''تحفہ'' بنا کر پیش کیا ہے۔

نقد وتبصرہ:

زیرِ بحث کتاب ''تحفۃ الطلبۃ ترجمہ مصباح الدجی فی شرح احادیث المصطفیٰ'' موضوع کے اعتبار سے صحیح احادیث کا ایک منفرد مجموعہ ہے۔ جس میں عام مسلمان کے لیے پیش آمدہ فقہی مسائل اور ضروریات دین پر بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ اس میں ہر موضوع سے متعلق احادیث صرف ''صحیحین'' سے لی گئی ہیں۔ مؤلف نے گویا احادیث کی صحت کے التزام کو زیادہ اہمیت دی ہے جو کہ انتہائی قابلِ ستائش ہے۔ دوسری خوبی یہ کہ مؤلف نے حدیث کا متن صرف اتنا ہی دیا ہے جتنا موضوع سے متعلق

ہے جس کی بناء پر کتاب طوالت کے بوجھ سے محفوظ رہی ہے۔

خصائص کے ساتھ ساتھ چند امور ایسے بھی ہیں جن کی وجہ سے کتاب اپنے اندر کسی قدر تشنگی رکھتی ہے۔

کتاب کا مقدمہ اگر چہ انتہائی معلومات افزا ہے تاہم اگر مختصراً دوسری اقسام حدیث کا تعارف بھی کروا دیا جاتا تو زیادہ بہتر تھا۔

علمِ حدیث اور اس کی اہمیت پر قدرے تفصیل کتاب کی شان میں مزید اضافہ کرسکتی ہے۔

روایتِ حدیث میں لفظ صحابی پر سند کو ختم کرنا درست نہیں کیوں کہ اس سے حدیث کے مرسل ہونے کا گمان ہوتا ہے۔

المختصر مجموعی طور پر یہ کتاب طلبہ حدیث اور عامۃ الناس کے لیے حدیث کا ایک بہترین اور خوب صورت انتخاب ہے۔ اس کتاب کی اہمیت کے پیش نظر اس کی طباعت واشاعت کا اہتمام کیا جانا چاہیے۔

۳۔ شمس الضحیٰ فی شرح مصباح الدجیٰ:

مولانا حافظ غلام مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ کی یہ معرکہ آراء تالیف ہے۔ دراصل یہ آپ رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''مصباح الدجیٰ'' کی تشریح وتوضیح پر مشتمل ہے۔ مؤلف نے اس کتاب کی نسبت کتاب کے افتتاحیہ خطبہ میں خود یوں تحریر فرمائی:

> ''احقر الخلیقۃ بل لا شئ فی الحقیقۃ، اضعف الضعفاء، حامل نعال الاولیاء بالخیر، غلام مرتضیٰ او صلہ اللہ تعالیٰ اِلی مایتمنّی۔۔۔''(۳۰)

مخطوط کے خصائص:

مولانا حافظ غلام مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ کی تالیف ''شمس الضحیٰ فی شرح مصباح الدجیٰ'' کا یہ مخطوط آپ رحمۃ اللہ علیہ کے خلف رشید صاحبزادہ پروفیسر محبوب حسین کی ذاتی لائبریری ''مکتبۃ المرتضویۃ'' میں اپنی اصل حالت میں موجود ہے۔ یہ مخطوط تا حال زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوا۔ مخطوط کے چند چیدہ چیدہ خواص درج ذیل ہیں:

یہ مخطوط آپ رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''مصباح الدجیٰ'' میں موجود دوسو پانچ (۲۰۵) احادیث کی ایک بسیط شرح وتوضیح پر مشتمل ہے۔ اس کے صفحات کی تعداد (۵۷۷) ہے۔ اس کے ساتھ ضمیمہ کے طور پر چند صفحات کا اضافہ بھی ہے جس میں مواعظ ونصائح اور عربی ضرب الامثال، نظم ونثر کی صورت میں موجود ہیں۔

مخطوط کے ہر صفحہ پر (۱۳) سطریں اور ہر سطر میں تیرہ سے لے کر اٹھارہ حروف ہیں۔ صفحات کا سائز (۱۷) سم طولا اور (۹) عرضا ہے۔ کاتب نے اسے قدیم نستعلیق رسم الخط میں لکھا ہے تاہم کہیں کہیں عبارت خط نسخ میں بھی ہے۔ کاتب نے مخطوط کی تحریر میں تین (سیاہ، سرخ اور سبز) رنگوں کی روشنائی استعمال کی ہے۔

حضور اکرم ﷺ کو ''جوامع الکلم'' کی خصوصیت عطا کی گئی۔ کلامِ رسول ﷺ ہی حدیث ہے اور آپ ﷺ کی اہمیت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ ﷺ کی احادیث کو سیکھ کر اس پر عمل کیا جائے۔ مؤلف رحمۃ اللہ علیہ کی یہ تالیف اپنے خصائص کی بدولت بالخصوص طلبہ اور بالعموم عوام الناس کے لیے بیش قیمت خزانہ ہے۔

مخطوط کا منہج و اسلوب:

عربی ادب میں حدیثِ نبوی ﷺ کو بہت بلند مقام حاصل ہے۔ اسی کی بدولت متقدمین و متاخرین محدثین نے اس پر بیش قیمت کتب تالیف کی ہیں۔ یہ سلسلہ جاری ہے اور تا قیامت جاری رہے گا اور ہر دور میں حدیثِ رسول ﷺ کی ترویج و اشاعت کے لیے علم کا باب کھلا رہے گا۔ مولانا حافظ غلام مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف بالخصوص جو علم حدیث پر ہیں، حدیث رسول ﷺ کی ترویج و اشاعت کے اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہیں۔ ان میں سے ''شمس الضحیٰ فی شرح مصباح الدجی'' احادیثِ رسول ﷺ کی شرح کا ایک نادر مجموعہ ہے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے اس شرح میں مذکورہ احادیث کے معانی و مطالب کو انتہائی بلیغ انداز میں پیش کیا ہے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے صرف الفاظ کے ظاہری معانی پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ ایسے افکار و اسرار روحانی بھی بیان کر دیے جو عموماً بڑی بڑی کتب میں نہیں پائے جاتے۔

آپ رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب کا آغاز اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے ساتھ ان الفاظ میں کیا:

''الحمد للہ رب العالمین، الرحمٰن الرحیم، مالک یومِ الدین والصلوۃ والسلام علی سید المرسلین و خاتم النبیین۔۔۔''(۳۱)

اس خطبہ میں مؤلف نے علم حدیث کی اہمیت اور کتاب کی تالیف کی غرض و غایت کو نہایت علمی و تحقیقی انداز میں بیان کیا ہے۔ متن کا آغاز محدثین کے طریق پر مشہور حدیث ''انما الاعمال بالنیات'' سے کیا ہے۔ اس ضمن میں مؤلف نے حسن نیت کے حوالے سے نہایت علمی اور ایمان افروز رموز بیان کیے ہیں اور انسانی زندگی میں ''بد نیتی'' کے اثرات و نتائج سے آگاہ کیا ہے۔

مؤلف رحمۃ اللہ علیہ نے اس مخطوط میں پندرہ (۱۵) ابواب قائم کیے ہیں اور ہر باب کے تحت مختلف فصول باندھی ہیں۔ آخر میں آپ رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب کا خاتمہ ''الخاتمۃ فی انواع شتیٰ'' کے عنوان سے تحریر کیا ہے۔ اس کے تحت نے بعض دعائیں اوران کے فضائل، نوافل کے فضائل، کفالت یتیم، اخلاق حسنہ کی ترغیب اور اخلاق رزیلہ سے ترہیب کے موضوعات بیان کیے ہیں۔ الغرض مؤلف نے ایک عمدہ علمی، تحقیقی اور اصلاحی اسلوب میں اس مخطوط کو تالیف کیا ہے اور یہ ہر خاص وعام کے لیے ایک عظیم علمی سرمایہ ہے۔

نقد و تبصرہ:

زیرِ بحث کتاب ''شمس الضحیٰ فی شرح مصباح الدجیٰ'' مولانا حافظ غلام مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ کی انتہائی دلکش اور بلیغ اسلوب میں احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظاہری الفاظ اور باطنی اسرار کی تشریح وتوضیح کا ایک نادر شاہکار ہے۔ بلاشبہ اس کتاب کو علمِ حدیث، فقہ ولغت، صرف ونحو اور علمِ معانی وبدیع کا بحرِ زخار کہا جا سکتا ہے۔ اس میں بیان کیے گئے شرعی علوم کے مفاہیم اور باطنی علوم کے اسرار سے تا قیامت لوگ مستفید ہوتے رہیں گے۔ مؤلف رحمۃ اللہ علیہ کا دور آج سے تقریباً دوصدی (۲۰۰ سال) قبل کا ہے اس لیے یہ کتاب دورِ جدید کے تقاضوں کے مطابق چند ایک حوالوں سے تشنگی کا احساس رکھتی ہے۔

- ☆ کتاب میں ابواب اور فصول بندی کا لحاظ تو رکھا گیا ہے لیکن اس میں ابواب اور عنوانات کی فہرست موجود نہیں۔
- ☆ احادیث کی تشریح وتوضیح میں اگر پیرابندی کا لحاظ رکھا جاتا تو مختلف پہلوؤں سے کی گئی تشریح کے ہر حصے کی الگ سے اہمیت قائم ہو جاتی۔
- ☆ احادیث کی تشریح میں جابجا اشعار واقوال کا استعمال کیا گیا ہے لیکن قائل یا شاعر کی نسبت ذکر نہیں کی گئی۔ اس بناء پر یہ پہلو تشنگی کا احساس رکھتا ہے۔

الغرض ان تمام امور کی باوصف کتاب ''شمس الضحیٰ فی شرح مصباح الدجیٰ'' اس قدر اہم ہے کہ آج کے دور میں مؤلف کی اس علمی کاوش سے دنیائے عالم کو روشناس کرایا جائے۔

۴۔ نزھۃ الناظرین وبھجۃ الطالبین:

مولانا حافظ غلام مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ کا ''مصباح الدجیٰ'' کی طرز پر یہ دوسرا مجموعہ انتخابِ حدیث ہے جس میں ایک سو انچاس (۱۴۹) احادیث شامل ہیں۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب کے دیباچے میں اس کی نسب اپنی

طرف بیان کی ہے۔ یہ کتاب مؤلف رحمۃ اللہ علیہ کے دور میں طبع بھی ہوئی ہے۔ اب اس کا اردو ترجمہ نامور ماہرِ تعلیم، صاحبِ علم و فضل پروفیسر ڈاکٹر محمد طفیل سالک (سابق صدرِ شعبہ فلسفہ، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور) نے ''گلدستہ احادیث'' کے نام سے تحریر کیا ہے اور مولانا حافظ غلام مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ کے علمی و روحانی فیوضات کے وارث ''صاحبزادہ پروفیسر محبوب حسین'' نے حسنِ طباعت کے زیور سے آراستہ کر کے شائع کیا ہے تاکہ ہر عام و خاص اس کے مطالعہ سے مستفید ہو سکے۔ یہ کتاب مؤلف نے اپنے بڑے بیٹے مولانا احمد سعید رحمۃ اللہ علیہ کے لیے لکھی اور درسی کتاب کے طور پر طبع کروائی۔ اس کا سنِ کتابت و طباعت ۱۲۷۵ھ ہے جو اصل نسخہ کے اختتام میں تحریر شدہ ہے۔ اس کتاب کے پیش لفظ میں اس کتاب کی تالیف کا مقصد اپنے بیٹے حافظ احمد سعید کے لیے تعلیم، احباب کے لیے تذکرہ، دوستوں کے لیے تحفہ اور یومِ حساب کے لیے زادِ عمل کے طور پر بیان کیا اور نام خود ہی ''نزھۃ الناظرین وبھجۃ الطالبین'' لکھ دیا۔ (۳۲)

کتاب کا مخطوط دستیاب نہیں تاہم پہلے والے مطبوعہ نسخے اور اس کے ترجمہ ''گلدستہ احادیث'' کے مطالعہ سے اس کتاب کے چند خواص کو ذکر کیا جا رہا ہے۔

☆ مولانا حافظ غلام مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب کے آغاز میں ایک مختصر سا مقدمہ اپنے قلم سے خود تحریر فرمایا جس میں آپ رحمۃ اللہ علیہ نے علمِ حدیث کے موضوع، حیثیت، تعریف اور غرض و غایت کو بیان کیا ہے۔ کتاب کے متن کو مشارق الانوار سے ماخوذ بتایا ہے۔ متن حدیث میں مؤلف نے (خ) کی علامت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے لیے، (م) کی علامت امام مسلم کے لیے اور (ق) کی علامت متفق علیہ حدیث کے لیے استعمال کی ہے۔ نیز کتاب کے متن کے مصادر اور بعض مستعمل علامات و ارشادات کا ذکر کر کے قارئینِ کتاب کو علمِ حدیث پڑھنے، عمل کرنے اور اس سے تعلق قائم رکھنے کی ترغیب دی ہے۔

☆ مؤلف رحمۃ اللہ علیہ نے پہلے حدیث کے لیے عنوان باندھا ہے بعد ازاں متن نقل کیا ہے پھر کتاب کا حوالہ لکھا ہے اور اس کے بعد صحابی راوی کا مختصر مگر جامع تعارف، صحابی کی کل مرویات اور صحیحین میں مرویات کی تعداد ذکر کی ہے۔ یہ تمام خصائص مؤلف کی کتاب کی استنادی حیثیت کو واضح کرتے ہیں۔

☆ فقہی احکام والی حدیث کی تشریح میں آئمہ کا اختلاف اور استدلال بھی بیان کیا ہے۔ کتاب کا اسلوب انتہائی بلیغ اور دلکش ہے مؤلف نے کتاب میں تمام قولی احادیث نقل کی ہیں۔

☆ کتاب میں احادیث اور ان کی تشریح و توضیح کے بعد مؤلف نے اختتامی دعا بھی تحریر کی ہے۔ آخر میں

ضمیمہ کی صورت میں چند عربی ضرب الامثال، عجائب وغرائب اور مواعظ کا ذکر بھی کیا ہے۔ دعا کے الفاظ یہ ہیں ''ولکن ھذا اخر ما اردنا و ختام ماقصدنا و الحمدللہ رب العالمین، و الصلوۃ علیٰ رسولہ محمد شفیع المذنبین و اٰلہ و اصحابہ الطیبین الطاھرین، امین''

الغرض مولانا حافظ غلام مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ کی اس تالیف کا مطالعہ کرنے کے بعد بلاتردد یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ علم حدیث کی ایک مستند اور جامع کتاب ہے جو مبتدی کی اصلاح اور محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک عظیم نسخہ ہے۔

کتب مواعظ ونصائح

۱۔ تحفۃ العافین وھدیۃ السالکین:

مولانا حافظ مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ کا دور برصغیر میں مسلمانوں کے انحطاط کا دور تھا۔ جس میں انگریزوں کے تسلط سے مسلمانوں کے مدارس اُجڑ گئے تھے۔ خانقاہیں ویران ہوگئیں تھیں۔ مسلمان فکری، ذہنی، سیاسی اور علمی و روحانی پستی کا شکار تھے۔ اس پرآشوب دور میں مؤلف رحمۃ اللہ علیہ نے جہاں اپنی علمی تالیفات سے مسلمانوں کی علمی وفکری آبیاری کی تو وہاں اپنے مواظ ونصائح پر مشتمل کتب کے ذریعے ان میں باطنی وروحانی انقلاب پیدا کیا اور مواعظ ونصائح پر مشتمل کتب تحریر کیں۔ زیرِ بحث مخطوط مولانا حافظ غلام مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ کے تحریر کردہ مواعظ میں سے ہے۔ اپنے فن اور حسن ترتیب کے اعتبار سے اس کتاب کا شمار اس موضوع کی اہم ترین کتب میں ہوتا ہے۔ یہ داخلی شہادت ہے کہ خود مؤلف نے کتاب کے خطبہ میں اس کتاب کی نسبت اپنی طرف تحریر کی ہے۔ یہ مخطوط اس وقت ''مکتبۃ المرتضویہ'' بیربل ضلع سرگودھا میں قابلِ قرأت حالت میں کتاب کی شکل میں موجود ہے۔ مخطوط کی کتابت میں خط نستعلیق اور خط نسخ کو اپنایا گیا ہے۔ مخطوط مؤلف رحمۃ اللہ علیہ نے کاتب سے تحریر کروایا ہے اور اس کا نام ''محمد نور عالم'' صفحہ آخر پر درج ہے۔ اس مخطوط کو مؤلف رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے استاد و مربی ومولانا غلام نبی للہی رحمۃ اللہ علیہ کے حکم پر زیور تحریر سے آراستہ کیا۔ مؤلف نے اس مخطوط میں ان مصادر کا بھی ذکر کیا ہے جن سے استفادہ کیا ہے۔ مصنف نے اسے سترہ (۱۷) ابواب میں تقسیم کیا ہے اور ہر بات کو ''مجلس'' کا نام دیا ہے۔ آخر میں تین فصول پر مشتمل ایک خاتمہ بھی تحریر کیا ہے۔ مخطوط کے منہج واسلوب کو اگر دیکھا جائے تو درج ذیل نکات سامنے آتے ہیں۔

☆ مؤلف رحمۃ اللہ علیہ نے مخطوط کا آغاز معروف طریق پر ایک جامع خطبہ سے کیا ہے جس میں حمد وثناء اور درود وسلام کا ذکر ہے۔ کتاب کے مقدمہ میں وجہِ تالیف اور غرض وغایت بیان کی ہے کہ متقدمین میں سے کئی کبار علماء نے ادب، مواعظ، حکمت اور حکایات پر مشتمل کتب تالیف کی ہیں اس لیے میں نے بھی اسے اپنے مربی ومرشد کے حکم پر مرتب کیا ہے۔ مزید مقدمہ میں ہی لکھتے ہیں کہ میں نے اس کتاب کو قرآنی آیات، احادیث مبارکہ اور صالحین کے حالات وواقعات سے مزین کر کے رضائے الٰہی کی خاطر مرتب کیا ہے۔

بعد ازاں مؤلف نے کتاب کے ابواب، جنہیں وہ مجالس کا نام دیتے ہیں، کے عنوانات ذکر کیے ہیں۔ چند ابواب کے نام بطورِ نمونہ درج ذیل ہیں:

☆ **المجلس الاول: فی التوبۃ والندامۃ والاستغفار**

☆ **المجلس الثانی: فی قولہ تعالیٰ (قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی)**

☆ **المجلس الثالث: فی قولہ تعالیٰ (حٰفظوا علی الصلوٰت)**

☆ **المجلس الرابع: فی قولہ تعالیٰ (یایھا الذین امنوا اذا نودی للصلوۃ)**

☆ **المجلس الخامس: فی قولہ تعالیٰ (والذین یکنزون الذھب والفضۃ)**

مؤلف کا اسلوب انتہائی دلکش اور مؤثر ہے۔ ان کی دیگر تالیفات کی طرح یہ بھی ادب، بلاغت، وعظ ونصیحت اور حکایات صالحین کا ایک خوبصورت اور دلچسپ مرقع ہے۔ اندازِ بیان اگرچہ فصاحت وبلاغت سے معمور ہے تاہم مشکل اور دقیق نہیں بلکہ عام فہم اور مربوط ہے۔ قرآنی آیات کی توضیح میں احادیث صحیحہ اور اقوال وآثار تائید کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ بعد ازاں موضوع سے متعلق حکایات کے ذکر سے وعظ ونصیحت کا انداز اختیار کرتے ہوئے قاری کو متاثر کرتے ہیں۔ مخطوط کا منہج اسلوب اس کی اہمیت کو عیاں کرتا ہے لہٰذا یہ مخطوط اس امر کا متقاضی ہے کہ اسے اردو ترجمہ کے ساتھ شائع کیا جائے تاکہ زبان زد عام ہو سکے اور ہر کوئی اس سے مستفید ہو سکے۔

۲۔ تذکرۃ للمحصنات:

''تذکرۃ للمحصنات'' مولانا حافظ غلام مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ کی خواتین کی دینی اور روحانی تربیت کے لیے وعظ ونصیحت کے انداز میں عدیم النظیر تالیف ہے۔ یہ مخطوط بھی آپ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے استاد ومربی کے حکم

پر تالیف کیا۔ آپ رحمۃاللہ علیہ نے خود اس کے دیباچے میں اس کی نسب اپنی طرف کی ہے۔ اس مخطوط کے بعض صفحات پر مولانا غلام مرتضیٰ رحمۃاللہ علیہ کی مہر خاص بھی ثبت ہے۔

تابع شرع رسول مجتبیٰ
احمدی حنفی غلام مرتضیٰ

ایک سو ستاون (۱۵۷) صفحات پر مشتمل یہ مخطوط پروفیسر محبوب حسین (ناظم ادارہ معین الاسلام، بیر بل، سرگودھا) کے پاس مکتبہ مرتضویہ میں قابلِ قرأت حالت میں موجود ہے۔ مخطوط بغیر اعراب کے عربی عبارت خط نسخ میں تحریر کیا گیا ہے۔ مخطوط کے بین السطور اور حاشیہ میں بعض مشکل الفاظ کے معانی اردو، فارسی اور عربی میں لکھے ہوئے ہیں۔ یہ مخطوط مؤلف نے برصغیر کے مسلمانوں کے علمی و اخلاقی انحاط کے خاتمہ کے لیے اور مسلمانوں کے گھروں میں اسلامی اقدار کے احیاء کے لیے تحریر کیا تا کہ مسلمان خواتین اس بے دینی اور الحاد کی مسموم فضا سے اپنی اولاد کو محفوظ رکھ سکیں۔

یہ مخطوط مؤلف رحمۃاللہ علیہ کے واعظانہ اندازِ تحریر کا شاہکار ہے۔ اس میں آپ رحمۃاللہ علیہ نے مسلم خواتین کے لیے دینی و شرعی احکام کی اہمیت قرآن و حدیث کی روشنی میں بیان کی ہے۔ مؤلف نے آغاز ایک مختصر سے مقدمہ سے کیا ہے جس میں مخطوط کے عنوان اور وجہ تالیف کا ذکر کیا ہے۔ مؤلف نے مسلمان عورت کی تعلیم و تربیت کی اہمیت قرآن و حدیث کی روشنی میں بیان کی ہے۔ خاص طور پر سورۃ النور کی روشنی میں پردے کے اسلامی احکام تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ آیات کی تفسیر کے بعد مؤلف ''الاحادیث الصحیحۃ'' کے عنوان سے موضوع سے متعلق احادیث ذکر کرتے ہیں۔ ان احادیث کے ذریعے مسلم خواتین کی واعظانہ انداز میں اخلاقی تربیت کرتے ہیں۔ مؤلف نے بعض روایات برزخی زندگی سے متعلق بھی نقل کی ہیں جس میں میت کو قبر میں پیش آنے والے احوال کا ذکر کیا ہے۔ ایصالِ ثواب سے متعلق حکایات اور روایات بھی اس مخطوط میں موجود ہیں۔ مخطوط میں علوم شریعت کے ساتھ ساتھ ادب و بلاغت مؤلف کا عظیم خاصہ تحریر ہے۔ آیاتِ قرآنی و احادیث و فقہی مسائل سے جہاں قاری کو اپنی تالیف کی توجہ کا مرکز بناتے ہیں وہاں ساتھ ساتھ دلکش تشبیہات، اقوال و ضرب الامثال، برمحل اشعار سے پند و نصائح کا اندازِ بلاتردد اس کتاب کو ایک انتہائی دلکش، جامع گردانتا ہے۔ ان خصائص کے پیشِ نظر اس مخطوط کی اردو ترجمہ کے ساتھ اشاعت ناگزیر ہے۔

OOO

حوالہ جات

۱۔ البقرہ : ۱۲۹

۲۔ پروفیسر، غلام عابد خاں، انوارِ عمر، لاہور: احباب پبلشر، ۱۹۹۱ء، ص ۲۵

۳۔ قادری، سلطان حامد، مناقب سلطانی/اعوان ، پرویز احمد خاں، تاریخ اعوانان فی اولاد علی، آزاد کشمیر: دوارندی ہجیرہ، س ن، ص۔ ۱۳۱

۴۔ بکھروی، عبدالرسول، انوار مرتضوی، نلی، خوشاب: مکتبہ عطائیہ، س ن، ص ۲۱

۵۔ مولانا، امام دین، بیاض قلمی، لِلہ، جہلم: مکتبہ خانقاہ لِلہ، س ن، ص ۶

۶۔ انوارِ مرتضوی، ص ۲۳

۷۔ ایضاً، ص ۲۴

۸۔ بیاض قلمی، ص ۸

۹۔ بیر بلوی، محمد عمر، حالات حضرت غلام مرتضیٰ بیر بلوی، سرگودھا: مکتبۃ المرتضویہ، ۲۰۰۸، ص ۷۸

۱۰۔ ڈاکٹر، سفیر اختر، تذکرہ علمائے پنجاب، لاہور: مکتبہ رحمانیہ، ۱۹۹۸ء، ص ۵۱۷، ۵۱۸

۱۱۔ انوارِ مرتضوی، ص ۱۴۹

۱۲۔ صاحبزادہ، عبدالرسول، تاریخ مشائخ نقشبندیہ، لاہور: زاویہ پبلشر، ۲۰۰۰ء، ص ۶۹۸

۱۳۔ عالم فقری، تذکرہ اولیائے پاکستان، لاہور: ادارہ پیغام القرآن، ۲۰۰۲ء، ص ۳۲۰

۱۴۔ تاریخ مشائخ نقشبندیہ، ص ۵۲۵

۱۵۔ انوارِ مرتضوی، ص ۱۶

۱۶۔ ایضاً، ص ۲۵

۱۷۔ حالات حضرت غلام مرتضیٰ بیر بلوی، ص : ۷۰، ۷۱

۱۸۔ بیر بلوی، غلام مرتضیٰ، تفسیر الحکم التکاثر (مخطوط)، ص ۱

۱۹۔ ایضاً، ص ۱

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۰۱

۲۱۔ ایضاً، صفحہ آخر

۲۲۔ بیربلوی، غلام مرتضیٰ، کتاب المعراج (مخطوط) ص ا

۲۳۔ ایضاً، ص ۴۴۶

۲۴۔ ایضاً، ص ۳۰۲

۲۵۔ بیربلوی، غلام مرتضیٰ، تحفۃ الطلبہ (مخطوط) ص ا۔۲

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۱۲

۲۷۔ ایضاً، ماقبل صفحہ آخر

۲۸۔ ایضاً، صفحہ آخر مخطوط

۲۹۔ ایضاً، ص ۱۱۲

۳۰۔ بیربلوی، غلام مرتضیٰ، شمس الضحیٰ فی شرح مصباح الدجیٰ، (مخطوط) ص ا

۳۱۔ ایضاً، ص ا

۳۲۔ سالک، محمد طفیل، گلدستہ احادیث، لاہور: زاویہ پبلشر، س ن، ص ۱۱

○○○

تصوف وطریقت کے چہار رنگ کا نظریہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ

پروفیسر ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی ☆

Abstract:

Hazrat shah waliullah was great Muslim reformist of 18th century in India. He was a brilliant thinker and scholar with critical insight of political as well as mystical scenario of that time. In order to bring the Muslim of India on right path and help them, shah waliullah worked really hard. He was an authentic theologian, good sufi and scholar of Islam. He has given the theory of four modes of Tasawwuf and treeqat i-e colour of Tasawwuf ,colours of treeqat o Tasawwuf, periods of treeqat, alterations of Tasawwuf o treeqat. Hazrat shah waliullah explained his theory of four modes of Tasawwuf through the famous books Al-Tahfhimat, Al-Ielahyyat, Hujjat Allah Al-Balighah and Hama'at . All these interpretations of these terms and periods of tasawwuf and tareaqat have been elaborated in this article.

Key Words:

Shah Waliullah, Refosrmist, India, Authentic, Theologian, Modes, Al-Tahfimat, Al-Ielahyyat, Hujjat Allah Al-Baligha.

☆ سابق صدر/ڈائریکٹر ادارہ علوم اسلامیہ، شاہ ولی اللہ دہلوی ریسرچ سیل، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، انڈیا

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی (احمد بن عبدالرحیم فاروقی، ۴ شوال ۱۱۱۴ھ/۲۱ فروری ۱۷۰۳ء، ۲۹ محرم ۱۱۷۶/ ۲۰ اگست ۱۷۶۲ء) جامع شریعت وطریقت تھے۔ وہ تمام شرعی ودینی علوم وفنون، قرآن وتفسیر، حدیث وفقہ وغیرہ کے متبحر عالم اور ایسے عظیم پارکھ کہ ان تمام علوم اسلامی ودینی کے مزاج وروح، حکمت وگہرائی اور وسعت واطلاق پر گہری نظر رکھتے تھے۔ اسی کے ساتھ وہ ان تمام علوم وفنون شرعی کے غالباً سب سے جلیل القدر اور ماہر ترین مؤلف ومصنف بھی تھے ان کی کتب شریعت۔۔۔ حجۃ اللہ البالغہ، فتح الرحمٰن، الفوز الکبیر، موی مصفی، شرح تراجم ابواب البخاری، ازالہ الخفاء وغیرہ۔۔۔ اسلامی دائرہ المعارف (مفصل بحث) کے کتب خاکسار جیسے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی۔۔۔ شخصیت وحکمت کا ایک تعارف، علی گڑھ ۲۰۰۱ء: تصانیف شاہ ولی اللہ کا تنقیدی تجزیہ علی گڑھ ۲۰۰۹ء وغیرہ: بلجان (بالیون)، جے ایم ایس، ریلیجن اینڈ تھاٹ آف شاہ ولی اللہ (انگریزی) لائیڈن ۱۹۸۶ء ابوالحسن علی ندوی تاریخ دعوت وعزیمت، لکھنؤ ۱۹۸۴ء، جلد پنجم: عبید اللہ سندھی، شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ، لاہور ۱۹۹۸ء اور دیگر کتب بر شاہ)

طریقت وتصوف میں ان کا امتیازِ خاص یہ تھا کہ وہ نظری اور عملی دونوں اقسام اور ان کی باریکیوں کے عظیم ترین پارکھ تھے۔ نظری اور علمی تصوف کی تعلیم انہوں نے اپنے والدِ گرامی شیخ عبدالرحیم بن شیخ وجیہ الدین فاروقی (۱۰۵۴/ ۱۶۴۴-۱۶۴۵ صفر ۱۱۳۱/ ۴ جنوری ۱۷۱۹ء) سے حاصل کی اور ان ہی سے سترہ سال کی عمرِ اکتساب کے دوران عملی تربیت اور نظری تعلیم بھی پائی۔ حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے علاوہ بعض دوسرے شیوخ خصوصاً شیخ ابوطاہر کردی مدنی (م ۱۷۳۳ء) سے نظری اور عملی تربیت پائی خود بھی اپنے مطالعہ وعمل سے اس میں پختگی پیدا کی۔ وہ تصوف میں بعض کتابوں اور متعدد رسالوں کے مؤلف بھی ہیں جو ان کے فنی تبحر پر دال ہیں۔ (۱)

ان کا سب سے منفرد، ممتاز اور قابلِ فخر تخصص یہ ہے کہ وہ شریعت وطریقت کے باہمی ارتباط کے بھی پارکھ تھے، عام طور سے تصوف وطریقت کو دین وشریعت کا ایک مدِ مقابل، حریف اور رقیب بنا کر پیش کیا جاتا ہے کہ دونوں کا نظام الگ الگ ہے حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی حکمتِ اسلامی، مہارت باطنی اور فراستِ ایمانی نے ان پر واضح کر دیا تھا کہ ان دونوں میں کل وجز کے تعلق کا ربط ہے دین وشریعت اصل اور کل ہے اور تصوف وطریقت اس کا جزو اور حصہ ہے اور جزو اپنے کل سے سارا نظری اور عملی اکتساب کرتا ہے اسی بالغ نظری نے حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ کو تصوف وطریقت کے چار رنگوں/الوان کا نظریہ پیش کرنے پر اکسایا اور اسی کا مطالعہ اس مقالہ کا موضوع ہے۔

مآخذِ نظریہ:

عبقری شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی دوسری اسلامی عبقری شخصیات کی مانند ایک اور بھی فکری اور علمی انفرادیت ہے وہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ (ابوحامد محمد بن محمد طوسی، ۴۵۰/ ۱۰۵۸ء۔۔۔ ۵۰۵/ ۱۱۱۱) اور امام ابنِ تیمیہ (تقی الدین احمد بن عبدالحلیم (۶۶۱/ ۱۲۶۳۔۔۔ ۷۲۸/ ۱۳۲۸) اور ان جیسے دوسرے عبقری محدثین و مؤلفین کی مانند اپنے افکار و نظریات کی شرح بار بار کرتے ہیں حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ کا تو یہ امتیازِ خاص ہے کہ وہ اپنے پسندیدہ افکار ونظریات پر مختلف حوالوں سے متعدد رسالوں میں بحث کرتے ہیں متاخرین اور ان میں سے بھی سہل نگاروں کی فطری مجبوری یہ ہے کہ وہ صرف کسی ایک ماخذ و کتاب اور رسالہ پر اکتفا کر لیتے ہیں اس لیے ان کی نظر سے افکار ونظریاتِ حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے تمام ابعاد و جہات (Dimensioned) اوجھل ہو جاتے ہیں۔

ان کے قصورفہم اور عجز استنباط اور معذوریٔ استخراج کا بھی کافی دخل ہوتا ہے جو ان کی ترجمانی کو داغدار اور پیش کش کو ناقص بناتا ہے۔ (۲)

بلاشبہ حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ اپنی کسی ایک کتاب بالخصوص فنی شاہکار میں اپنے کسی خاص نظریہ وفکر کو پیش کرتے اور اکثر و بیشتر اس کی فکری داغ بیل اپنی اسلامی قاموس اور ام الکتاب۔۔۔ حجۃ اللہ البالغہ۔۔۔ میں پہلے پہل ڈالتے ہیں اس کو فکری ارتقاء کی سان پر چڑھا کر تصنیفی و تالیفی شرح و بسط کے ساتھ کسی خاص رسالہ یا کتاب میں اجاگر کرتے ہیں ان کی تیسری فکری، علمی اور تصنیفی صورت گری یہ ہوتی ہے کہ وہ اس خاص فکر و نظر کی بعض خاص جہات والجاد کی وضاحت اور شرح و بسط کسی دوسری تالیف وتصنیف میں بھی کرتے ہیں حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے اس طریقۂ کار سے سہل پسند واقف نہیں ہوتے اور چند کلیوں میں قناعت کر کے اپنے دامنِ فکر و ادا کو تنگ تو کر ہی لیتے ہیں اور اس کی وجہ سے دوسروں کو بھی غلط فہمی کا شکار بناتے ہیں۔

حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے چہار رنگ ہائے تصوف کے نظریہ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ مترجمین وشارحین نے اپنی عاجزانہ شرح سے اہلِ علم کو بھی گمراہ کیا۔ (۳) چہار رنگہائے تصوف والوانِ طریقت کا نظریہ وفکر حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے بنیادی طور سے اپنی عظیم تالیف تصوف وطریقت۔۔۔ ہمعات میں خاصی شرح و بسط کے ساتھ پیش کیا۔ وہ بلاشبہ اس فکر ونظریۂ شاہ رحمۃ اللہ علیہ کا بنیادی اور عظیم ترین ماخذ ہے مگر وہی کل نہیں ہے۔ اس نظریہ وفکر کی بعض جہات۔۔۔ اہم ترین جہات۔۔۔ پر حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے بعض دوسری تصانیف میں بھی بحث

کی ان میں حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی کشکولِ طریقت۔۔۔التفہیمات الالٰہیہ۔۔۔کی بعض تفہیمات بھی شامل ہیں جن میں ان پر بحث آئی ہے ان کے ساتھ حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی مجموعی فکر اسلامی اور وسیع تر فکر طریقت کے تناظر میں بعض دوسرے نظریات وافکار کے ساتھ بھی اس کا مطالعہ کرنا ضروری ہے ورنہ اس عظیم فکر ونظریہ شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی عظمت، انفرادیت، وسعت اور اطلاق سمجھ میں نہیں آ سکتا۔

الفاظ واصطلاحاتِ نظریہ:

اپنے اسلامی وشرعی افکار کے علاوہ خاص صوفی نظریات میں حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے بعض مخصوص الفاظ و تعبیرات استعمال کی ہیں۔ وہ اپنے معانی اور اطلاقات (applications) دونوں کے لحاظ سے بہت اہم ہوتی ہیں کہ ان کے متبادل ان سے محروم ہوتے، حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اس خاص نظریہ طریقت کے کئی الفاظ وتعبیرات کا استعمال کیا ہے جو حسب ذیل ہیں۔

۱۔ رنگ/رنگہائے تصوف

۲۔ الوانِ طریقت وتصوف

۳۔ دورہ/دوراتِ طریقت

۴۔ تغیراتِ تصوف وطریقت

ان گونا گوں الفاظ واصطلاحاتِ حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان سے مراد زمانی ادوار نہیں ہیں جو بالعموم توقیتی اور تاریخی زمانی ادوار کی وجہ سے خاص زمانہ اور تاریخی دور کی حد بندی میں آ جائیں لہٰذا ان کو زمانی یا تاریخی ادوار (Chronological periods) کہنا صحیح نہیں ہے۔ حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تشریحات میں واضح کیا ہے کہ طریقت وتصوف کے طریقوں میں چار رنگ، الوان، دورات اور تغیرات آئے اور ان کو ان سے یا ان کی حقیقت سے وہی طریقے سے آگاہ کیا ان کو زمانی دور/ادوار قرار دینے سے بہت سی غلط فہمیاں اور نارسائیاں پیدا ہوتی ہیں اور ان کا شکار خاصے اہلِ علم ہوئے۔(۴)

تفہیماتِ الٰہیہ کی ایک تفہیم۔۔۔۱۳۱ میں حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے ان تمام دوراتِ طریقت کو دو بنیادی دورہ میں تقسیم کیا اوّل دورہ کو دورۂ شریعت کہا ہے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک، صحابہ کرام کے دورِ عظمت اور تابعین عظام کے دورِ ولایت کو حاوی تھا جب شریعت ودین خالص کا بول بالا اور اسی کے اعمال و اشغال پر سب عوام وخواص کا عمل وتعامل قرار پایا تھا اس کے بعد کا دوسرا دورہ ان کی زبان میں دورۂ طریقت

ہے جو سید الطائفہ حضرت شیخ جنید بغدادی (ابوالقاسم جنید بن محمد جنید بغدادی۔۔۔۲۹۷/۹۱۰) کے زمانے سے شروع ہوا اور یہ دونوں دوراتِ شریعت وطریقت شانہ بشانہ چلتے رہے۔

چاروں دورات/رنگہائے تصوف کا بیان:

دورۂ شریعت وطریقت:

حضرت شاہ نے ''اولین دورہ'' رنگ کے بارے میں جو کچھ ھمعات میں لکھا ہے اس کا ترجمہ حسب ذیل کیا گیا ہے:

''رسول اللہ ﷺ اور ان کے صحابہ کے زمانے میں چند نسلوں تک ''اہلِ کمال'' کی بیشتر توجہ زیادہ تر شریعت کے ظاہری اعمال کی طرف رہی۔ ان لوگوں کو باطنی زندگی کے جملۂ مراتب شرعی احکام کی پابندی کے ذیل میں ہی حاصل ہو جاتے تھے چنانچہ ان بزرگوں کا ''احسان'' یعنی حاصلِ تصوف یہ تھا کہ وہ نمازیں پڑھتے تھے، ذکر و تلاوت کرتے تھے، روزے رکھتے تھے حج کرتے تھے، صدقہ اور زکوٰۃ دیتے تھے اور جہاد کرتے تھے۔ ان میں سے کوئی شخص ایسا نہ تھا جو سر نیچے کیے بحرِ تفکرات میں غرق نظر آتا۔ یہ بزرگ خدا تعالیٰ سے قرب وحضوری کی نسبت اعمال شریعت اور ذکرِ اذکار کے سوا کسی اور ذریعے سے حاصل کرنے کی سعی نہ کرتے تھے بے شک ان اہلِ کمال بزرگوں میں سے جو محقق ہوتے ہیں ان کو ذکر واذکار اور نماز میں لذت ملتی، قرآن مجید کی تلاوت سے متاثر ہوتے۔۔۔اسی طرح شریعت کے دوسرے احکام بجالاتے۔۔۔ان شرعی احکام کی بجا آوری سے ان کے باطنی تقاضوں کی تسکین بھی ہوتی تھی۔ ان میں سے کوئی شخص نہ بے ہوش ہوتا اور نہ اسے وجد آتا، نہ وہ جوش میں آکر کپڑے پھاڑتا، نہ شطح یعنی خلاف شرع کوئی لفظ اس کی زبان سے نکلتا۔ یہ بزرگ تجلیات اور اس کے دوسرے مسائل کے متعلق گفتگو نہ کرتے کشف وکرامات اور خوارق ان سے بہت کم ظاہر ہوتے اور سرمستی اور بے خودی کی کیفیت بھی شاذ و نادر ہی ان پر طاری ہوتی اور اگر کبھی کبھی یہ باتیں ان سے صادر بھی ہوتیں تو قصداً نہیں، بلکہ محض اتفاق سے ایسا ہوتا، بات یہ ہے کہ وہ نفسی کیفیات جن کا نتیجہ کرامات، خوارق اور سرمتی و بے خودی کی قبیل کی چیزیں ہوتی ہیں، یہ کیفیات ان بزرگوں کے اندر اتنی راسخ نہ ہوتی تھیں کہ وہ ملکہ بن جاتیں۔ یہ چیزیں ایسی نہ ہوتیں کہ عوام کی ان تک رسائی نہ ہوسکتی۔

قصہ مختصر اس دور میں ''جسے تصوف یا احسان کا پہلا دور کہنا چاہیے ''اہلِ کمال'' کا غالب طور پر یہی حال رہا ہے۔(۵)

ہمعات کی اس بحث شاہ اوراس کے اردو ترجمہ کے بعض الفاظ واصطلاحات کی طرف توجہ کرنی ازبس ضروری ہے۔''اہلِ کمال'' اورعوام کی دو اصطلاحات استعمال کر کے حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے واضح کیا ہے کہ خواص میں اہلِ کمال شامل تھے اورعوام الناس ان سے مختلف لوگ تھے جن کی استعدادات مختلف وفرقیہ تھیں۔ حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے طریقت وتصوف کو ہمیشہ اہلِ کمال اوران کے ادنیٰ، اوسط اوراعلیٰ طبقات کا وظیفۂ حیات وطریقۂ عمل قرار دیا ہے۔انہوں نے عوام اوران کے طبقات سے اسے بالاتر بتایا ہے توجہ، باطنی زندگی، جملہ مراتب، احسان، حاصلِ تصوف، کشف وکرامت، خوارق، بحرِ تفکرات، سرمستی و بےخودی کی تمام اصطلاحات صوفیانہ ہیں اوران میں سے صرف احسان اس اولین ''پیش دورۂ شریعت'' میں پایا جاتا تھا جو حدیثی ہے۔(۶)

تفہیم ۔۔۔ ۱۳ کا بنیادی موضوع فلسفیانہ تصوف کا ایک مبحث ہے: ''مرتبہ عقل میں حقائق کی تمیز کرنے کا بیان اور انبیاءؑ اور اولیاءؒ کے بعض خصائص کا ذکر۔'' اسی میں دوسرے انبیاء کرام کے بعد رسول اکرمؐ کے خصائص کی بحث ہے جو اس بحث ونظریۂ شاہ رحمۃ اللہ علیہ سے متعلق ہے۔اس کا خلاصہ یہ ہے:

علم باطن کے راز (سر) کی حکمت یہ ہے کہ حضرت پیغامبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس سر کا عنوان ہیں بایں طور کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاتم النبوۃ اور فاتح الولایہ ہیں۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے راہِ ولایت کے فاتح ہونے کا معنی یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چہرۂ انور عالم کے انسلاخ کی طرف ہے اور وہ فنائے بحث کے مقدمات میں سے ایک مقدمہ ہے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ہی ہر فاتح وخاتم باب ولایت کا فاتح وخاتم ہوتا ہے اس امت مرحومہ کے اولین فاتح حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ ہیں کہ وہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فاتحیت کے ایک جارحہ (عضو) کی مانند ہیں۔۔۔حضرت امیر کرم اللہ وجہہ کا سر (حکمت) ان کی اولاد کرام میں سرایت کر گیا اور حضرت جنید قدس سرہ کے زمانے تک ان کے خاندان میں ایک کے بعد دوسرا شخص اس لمعۂ نبوت کا حامل ہوا کہ اس کا زمانہ بطون (اندرون) کی طرف ہمیشہ متوجہ رہتا ہے۔۔۔اور دوسرے فاتح وخاتمِ وقائع دیگر سید الطائفہ جنید قدس سرہ ہیں کہ اس شعلہ کو اپنے اندرون میں بسا کر (پیچا پندہ) اوپر کی جانب متوجہ کر دیا۔اس وقت احوال ظاہر ہوئے جیسے توکل، تسلیم وغیرہ۔گذشتہ (پیشین) دورہ دورہ شریعت تھا اور یہ دورۂ طریقت ہے کہ امت کے اولیاء میں سے کوئی ایسا نہیں جو سید الطائفہ سے منسوب نہ ہو۔۔۔''(۷)

حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے دورۂ شریعت سے دورۂ طریقت تک کے سفر وانتقال پر اس تفہیم میں فلسفیانہ بحث کی ہے۔اس کا واقعاتی اور دینی اور طریقی /صوفی پہلو یہ ہے کہ حضرت جنید بغدادی سے قبل کے دورہ/ رنگ تصوف کو شریعت سے تعبیر کیا ہے ہمعات کی مذکورہ بالا بحث وشرح میں بھی وہ واضح ہے۔اس میں لفظ

تصوف تصور کا آ جانے سے بعض اہلِ علم کو غلط فہمی ہو گئی ہے کہ حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے اولین قرون خیر کے اہلِ کمال کے احسان کو تصوف (رواجی تصوف کا دور) قرار دے دیا، حالانکہ ایسا نہیں ہے حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو حدیثی لفظ واصطلاح احسان سے تعبیر کیا ہے جو صحابہ کرام اور ان کے جانشینوں کو شرعی احکام کی بجا آوری سے حاصل ہو جاتا تھا اور اس سے ان کے باطنی تقاضوں کی تسکین ہو جاتی تھی اور سب سے اہم بات کہ وہ عوام کی دسترس سے دور نہ تھا تفہیم: ۱۶۱ میں اولین دورہ کا نام ''دورۃ الایمان'' رکھا ہے اور اس کی جو وضاحت کی ہے وہ اسے شرعی اور اوامر واحکام کی بجا آوری سے باطنی ترقی اور روحانی تزکیہ کی ضمانت قرار دیتی ہے۔ (۸)

دوسرا دورہ/رنگ/تغیرِ تصوف

تفہیماتِ الٰہیہ کی مذکورہ بالا تفہیم۔۔۔ ۱۳ میں اختصار کے ساتھ اور ہمعات میں شرح وبسط کے ساتھ حضرت شاہ نے دوسرے رنگ پر بحث کی ہے:

''حضرت جنیدؒ، جو گروہِ صوفیہ کے سرخیل ہیں، ان کے زمانے میں یا ان سے کچھ پہلے تصوف کے ایک اور رنگ کا ظہور ہوتا ہے۔

۱۔ اس زمانے میں یہ ہوا کہ ''اہلِ کمال'' میں سے ایک ''عام طبقہ'' تو اسی طریقہ پر کاربند رہا جس کا ذکر پہلے دورہ کے ضمن میں ہو چکا ہے۔

۲۔ لیکن ان میں سے جو خواص تھے انہوں نے بڑی بڑی ریاضتیں کیں اور دنیا سے بالکل قطع تعلق کر لیا اور مستقل طور پر وہ ذکر وفکر میں لگ گئے۔ اس سے ان کے اندر ایک خاص کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس کیفیت سے مقصود یہ تھا کہ دل کو تعلق باللہ کی نسبت حاصل ہو جائے۔ چنانچہ یہ لوگ اس نسبت کے حصول میں لگ گئے۔ وہ مدتوں مراقبے کرتے اور ان سے تجلی، استتار، انس اور وحشت کے احوال و ایثار ظاہر ہوتے اور وہ اپنے ان احوال کو نکات اور اشارات میں بیان کرتے۔۔۔ یہ لوگ سماع سنتے، سرمستی و بےخودی میں بے ہوش ہو جاتے، کپڑے پھاڑتے۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔

۳۔ الغرض اس دور کے اہلِ کمال کا تصوف یہ تھا کہ وہ خدا کی عبادت دوزخ کے عذاب سے ڈر کر یا جنت کی نعمتوں کی طمع میں نہ کرتے تھے بلکہ ان کی عبادت کا محرک خدا کے ساتھ ان کی محبت کا جذبہ تھا۔

۴۔ لیکن تصوف کے اس دورہ/رنگ میں ''توجہ'' کی نسبت اپنے درجۂ کمال تک نہیں پہنچی تھی۔ توجہ سے مراد یہاں ''نفس'' کا پوری طرح حقیقۃ الحقائق یعنی ذاتِ خداوندی کی طرف متوجہ ہونا ہے اور وہ

اس طرح کہ نفس اللہ کے رنگ میں رنگا جائے اور وہ دنیا کی عارضی اور فانی چیزوں پر پوری طرح غالب آجائے۔تصوف کے اس دورہ میں توجہ کی نسبت دوسری چیزوں سے ملی جلی ہوتی تھی۔۔۔

۵۔ اصل بات یہ ہے کہ ان بزرگوں/اہلِ کمال پر طاعت کا رنگ غالب تھا اور طاعت کے انوار سے وہ سرشار تھے۔(۹)

حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی اس شرح وتفصیل میں تین چار نکات قابلِ غور وفکر ہیں کہ ان پر سارا مدارِ بحث و تجزیہ ہوگا:

اوّل: دوسرے دورہ/رنگ تصوف میں ''اہلِ کمال'' کے دو طبقات تھے: ایک عام طبقہ جو دورۂ شریعت پر کار بند رہا۔ دوسرا خواص جو ریاضات شاقہ کا عادی، دنیاوی علائق سے قطع تعلق کرنے والا اور مستقل ذکر وفکر کا خوگر بن گیا۔

دوم: ان خواص اہلِ کمال کی نسبت توجہ بھی ابھی کامل نہ تھی۔

سوم: ان پر اطاعت شریعت و دین کا رنگ غالب تھا۔

تیسرا دورہ/رنگِ تصوف:

ہمعات میں حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی وضاحت میں لکھا ہے کہ:

''سلطان الطریقہ شیخ ابوسعید بن ابی الخیر رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ ابوالحسن خرقانی کے زمانے میں طریق تصوف میں ایک اور تفسیر رونما ہوتی ہے۔

۱۔ اس دور میں اہلِ کمال میں سے ''عوام'' تو حسبِ سابق شرعی اوراوامر واعمال پر ٹھہرے رہے۔

۲۔ اور خواص نے باطنی احوال و کیفیات کو اپنا نصب العین بنایا۔

۳۔ اور جو خواص (الخواص) تھے انہوں نے اعمال واحوال سے گزر کر ''جذب'' تک رسائی حاصل کی۔

۴۔ اور اس ''جذب'' ہی کی وجہ سے ان کے سامنے ''توجہ'' کی نسبت کا راستہ کھل گیا اور اسی سے ''تعینات'' کے سب پردے ان کے چاک ہوگئے اور انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ وہی ایک ذات ہے جس پر تمام اشیاء کے وجود کا انحصار ہے اور وہی ذات سب اشیاء کی ''قیوم'' ہے۔

۵۔ یہ لوگ اس ذات میں گم ہوگئے اور اس کے رنگ میں ان کے نفوس رنگے گئے۔

۶۔ چنانچہ اس حال میں نہ ان کو اوراد و وظائف کی چنداں ضرورت رہی اور نہ انہیں مجاہدے اور ریاضتیں

کرنے اور نفس اور دنیا کے فریبوں کو جاننے کی سدھ بدھ رہی۔ ان کی تمام تر کوشش کا مقصد یہ ٹھہرا کہ جس طرح بھی ہو "توجہ" کی نسبت کی تکمیل کریں۔ توجہ کے علاوہ باقی جو نسبتیں ہیں یہ لوگ انہیں نورانی حجاب سمجھتے تھے۔

۷۔ اس عہد میں توحید وجودی اور توحید شہودی میں فرق نہیں کیا جاتا تھا۔ دراصل ان بزرگوں کی اصل غایت یہ تھی کہ ذاتِ الٰہی میں اپنے وجود کو گم کرے اس مقام کی کیفیات سے لطف اندوز ہوں۔ چنانچہ وہ اس بحث میں نہیں پڑتے تھے۔۔۔فنا و بقا کے کیا حقائق ہیں؟(۱۰)

تفہیمات الٰہیہ میں حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس دورہ کا خاتم وفاتح صرف سلطان الطریق ابوسعید بن ابی الخیر کو قرار دیا ہے اور شیخ ابوالحسن خرقانی کا نام نہیں لیا۔ اس دورہ و رنگ کی تعبیر بھی مختصر کی ہے کہ "بساطِ احوال را در نوردیدہ مرکز دائرہ و مطمح ہمم فنا در نقطۂ وجود و بقا بآن ساخت"(۱۱) تفہیم۔۱۶۱ میں حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس دورہ/رنگ طریقت کو زمان قرب النوافل قرار دے کر اس کی تشریح کی ہے۔(۱۲)

چوتھا دورہ/رنگِ تصوف

حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ ہمعات میں رقمطراز ہیں:

۱۔ آخر میں شیخ اکبر محی الدین ابنِ عربی اور ان سے کچھ پہلے کا زمانہ آتا ہے۔

۲۔ اس عہد میں ان اہلِ کمال۔۔۔کیفیات و احوال کی منزل سے آگے بڑھ کر حقائقِ تصوف کی بحث و تدقیق کرنے لگتے ہیں۔ ذات واجب الوجود سے یہ کائنات کس طرح صادر ہوئی؟ ان بزرگوں نے ظہور وجود کے مدارج اور تنزلات کی ریاضت کے بعد اس امر کی تحقیق کی کہ واجب الوجود سے سب سے پہلے کس چیز کا صدور ہوا اور کس طرح یہ صدور عمل میں آیا۔

۳۔ الغرض یہ اور اس طرح کے دوسرے مسائل ان لوگوں کے لیے موضوعِ بحث بن گئے۔(۱۳)

اسی بیان کو اختصار کے ساتھ تفہیم۔۱۳ میں اس طرح بیان کیا ہے:

"وخاتم فاتح دیگر شیخ اکبر شیخ محی الدین بن علی بن عربی است قدس اللّٰہ تعالیٰ سرہ العزیز کہ مطمح نظر کشفِ حقائق الٰہیہ و کونیہ بوجدان ساختہ آنہمہ اعمال و احوال و فنا و بقا را امور مُعدہ شمرد۔۔۔"(۱/۱۰۴)

ایک اور تفہیم، ۱۶۱ میں حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے دوراتِ اربعہ کی بحث میں اس چوتھے دورہ کو "زمان

الحکمۃ'' کہا ہے۔اس کے کمالات واوصاف پر الگ تفہیم میں بھی بحث کی ہے: ۲/ ۱۹۲۔ ۱۹۴ مابعد۔

چاروں دورات طریقت پر تبصرہ شاہؒ:

''تصوف کے ان چاروں دوروں'' میں جو بھی اہلِ کمال بزرگ گزرے ہیں، گو وہ اپنے اعمال واحوال میں الگ الگ نظر آتے ہیں۔لیکن جہاں تک ان کی ''اصل'' کا تعلق ہے میرے نزدیک وہ سب ایک ہیں۔ ان بزرگوں میں سے جب کسی نے اس دنیا سے انتقال فرمایا تو جو ''باطنی کیفیت'' اپنی ہمت اور ریاضت سے دل میں پیدا کر لی تھی وہ کیفیت موت کے بعد بھی اس بزرگ کے ''نفس'' میں جاگزیں رہی۔

ان بزرگوں کے طفیل مبداء اول یعنی خدا تعالیٰ تک پہنچنے کا راستہ قریب ہو گیا اور ان کی برکات کے انوار سے عالم علوی اور عالم سفلی کی فضا منور ہو گئی۔۔۔اسی طرح ان نفوس قدسیہ کی کیفیات بھی دنیائے قلوب پر اپنا اثر ڈالتی رہتی ہیں۔الغرض تصوف کے یہ چاروں کے چاروں طریقے خدا تعالیٰ کے نزدیک مقبول ہیں اور ملأ اعلیٰ میں بھی ان سب کی منزلت مسلم ہے۔اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ ان بزرگوں پر طبقے کے اقوال اور احوال کو ان کے زمانے کے ذوق کے مطابق جانچا جائے اس سلسلے میں یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ ہم ایک عہد کے اربابِ تصوف کے اقوال اور احوال کو دوسرے عبارت خدف ہے۔ (۱۴)

پانچواں دورہ/رنگ: طریقت ولی اللہیؒ:

اپنے مشہور ومعروف نظریہ چہار رنگ ہائے تصوف کے ذکر کے بعد حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے پانچواں رنگ/دورہ بھی بیان کیا ہے جو تفہیمات الٰہیہ میں مفصل آیا ہے مگر وہ زیادہ معروف ومشہور نہیں ہو سکا، البتہ ماہرین فکر حضرت شاہ اسے جانتے ہیں۔اس کا یہاں ذکر محض فکر ونظریہ حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے تسلسل کی خاطر کیا جا رہا ہے ورنہ وہ ایک بسیط تحقیقی مقالہ کا تقاضا کرتا ہے۔اس خاص تفہیم۔ ۳۱ میں چہار دورات طریقت و شریعت کا مختصر ذکر کرنے کے بعد حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ قرون بسیار (بہت طویل عرصے) کے بعد ایک اور شخص دورۂ طریقت کا خاتم وفاتح بن کر پیدا ہوا جس نے تمام کمالاتِ انسانیہ'' کو تقسیم ودرجہ بند کر کے ان میں سے ہر ایک کو اس کی جگہ پر رکھا اور اس میں علوم شخصی کا قطعی کوئی اختلاط وامتزاج نہیں ہوا ان کا مورد وماخذ اصلاً حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قلب ہے جس سے اس خاتم وفاتح کے قلب پر فیضان خاص ہوا ہے۔

حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس خاتم وفاتح کی خصوصیات گنائی ہیں جن میں ایک یہ ہے کہ وہ ''مجددیت وصایت'' اور ''قطبیت وارشادیت'' کے جامع ومانع قائم ہے۔یعنی دونوں کا قیام اس کو عطا کیا گیا ہے۔مجدد

کی فروع میں سے سنت سنیہ کے طریقہ پر فقہ میں کلام کرنا ہے جس میں قیاسی نوامیہ کا اختلاط نہ ہو اور علم کلام میں تکلم وکلام صحابہ اور تابعین کے منہاج پر کہا جائے۔ وصایت کی فروع میں سے احکام وترغیبات وترہیبات، انبیاءؑ کے قصص کی تاویل اور ان تمام چیزوں کے اسرار پر کلام کرنا ہے جو انبیاء کرام نے اپنی زبان مبارک سے بیان فرماتے ہیں۔ قطبیت ارشادیت کے فروع میں سے ایک یہ ہے کہ طریقت کو اس طرح ضبط (مرتب) کرے کہ وہ باطن کے مطابق لسانِ فیض کی ترجمان اس طور سے اس زمانہ میں بن جائے کہ وہ مقبول ہو جائے اور امید یہ ہے کہ ان شاء اللہ اس کے ہاتھ پر زمانہ تازہ ہو گا جیسا کہ رسول اکرم ﷺ نے اپنی ایک حدیث میں فرمایا ہے: **ان الزمان قد استدار کھیئۃ یوم خلق اللہ السموات و الارض** (بخاری ومسلم)۔ خاتمین اور فاتحین کے پیچھے ایک ایسی قوم ہے کہ ان کے درمیان ارشاد کا سر (راز) ظہور میں آئے اور وہ لوگ اصحابِ طریق بن جائیں۔ **سبحانک لا علم لنا الا ما علمتنا انک انت العلیم الحکیم۔**"(۱۵)

حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس دورہ میں خاتم وفاتح کا نام نہیں لیا مگر اس میں ان کی مراد ان کی ذات والا صفات ہے اور اس میں ذرا بھی شبہ نہیں اس پورے بیان اور دورہ پنجم کا ماحصل یہ ہے کہ حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ کا طریقہ تصوف شریعت وطریقت دونوں کا جامع ترین نسخہ ہے۔

مختصر تنقیدی تجزیہ:

اگرچہ حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے چہار رنگ ہائے تصوف یا پنج دوراتِ طریقت کا مصدر فیضان والہام کو قرار دیا ہے مگر اس کی تشریح وتعبیر میں ان کی حکمت وفراست کے ساتھ ساتھ ان کی عمیق فکر اور وسیع مطالعہ اور ہمہ جہت تدبر کا پورا پورا ہاتھ ہے۔ حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی ایک حکیمانہ طریقت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے الہامی فیوض و ربانی فیضانات میں فکر ونظر سمو دیتے ہیں اور ظاہر ہے کہ فکر ونظر، حکمت وفراست، تدبر وتعقل اور ان جیسی تمام دوسری صفاتِ قلبیہ اور سارے ملکاتِ عقلیہ بھی فیضانِ ربانی اور الہامِ الٰہی ہی پر مبنی ہوتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ عقلیت پسند ان کی حقیقت کو نہیں سمجھ پاتے (فیوض الحرمین کے تمام مشاہدات الہام والقاء اور فیضانِ الٰہی پر مبنی بتائے ہیں مگر ان کے اندر بھی فکر وتدبر کی عملداری ملتی ہے اور بعد میں اپنی تحقیقات سے ان کو مزید نکھارتے ہیں۔ فیضان والہام میں تدبر وتعقل کی آمیزش کا وہ کلاسیکی نمونہ ہے، اگر تمام دوسرے رسائلِ تصوف میں بھی اس کی کارفرمائی ملتی ہو۔)

صوفیائے کرام کے طویل وجلیل سلسلہ میں غالباً حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ واحد ایسے صوفی مفکر ہیں جنہوں نے

تصوف و طریقت کے رنگوں، دوروں اور تغیروں کا پتہ چلایا ہے اور ان کے آغاز و ارتقاء، تسلسل و قیام اور اثر انگیزی پر بحث کی ہے۔ بالعموم دوسرے مؤلفین صوفیائے کرام نے یا تو تاریخِ صوفیہ لکھی ہے یا تصوف و طریقت کے اعمال و اشغال اور ان کے فروق سے بحث کی ہے سوائے حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے کسی اور کی تحریر میں ان دوروں، رنگوں اور تفسیروں اور ان کے اپنے خاص امتیازات کا پتہ نہیں چلتا۔

اس نظریہ حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے بعض امتیازات و اوصاف بڑے حکیمانہ، دور رس نتائج کے حامل اور قطعی اسلامی ہیں۔ (ابو طالب کی قوت القلوب، جو بقول شاہ تمام متاخر صوفیہ اور ان کی تصنیفات کا اصل ماخذ ہے، اور امام غزالی، شیخ عبدالقادر جیلانی، شہاب الدین سہروردی، ابو بکر سراج، کلاباذی، شیخ علی ہجویری اور تمام کتب تصوف تاریخ و تعلیمات سے بحث کرتی ہیں۔ ان کے علاوہ طبقاتِ صوفیہ کی کتب بھی ہیں۔

اول امتیاز جو صرف خاص نہیں بلکہ عظیم ترین اور وسیع ترین ہے وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقدس دور سے حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے ظہور تک اولین دورۂ شریعت ہے۔ حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو خالص دورۂ شریعت قرار دیا ہے جس میں شریعت ہی طریقت تھی، وہی احسان بھی تھا اور وہی تصوف بھی اگر اسے یہ متاخر زمانے کا مشہور نام دینے پر اصرار کیا جائے۔ اولین رنگ و دورۂ طریقت کے بنیادی ارکان و اوصاف یہ ہیں:

اہلِ کمال کی بیشتر توجہ زیادہ تر شریعت کے ظاہری اعمال کی طرف رہی۔

ان لوگوں کو باطنی زندگی کے جملہ مراتب شرعی احکام کی پابندی کے ذیل میں مل جاتے تھے۔

ان کا احسان یعنی حاصلِ تصوف نماز، روزہ، زکوۃ، حج، جہاد اور ذکر و تلاوت جیسے احکام کی پابندی سے حاصل ہو جاتا تھا۔

عوام کی بھی ان تک رسائی یکساں طور سے تھی اور وہ بھی اہلِ کمال کی طرح احسان پا لیتے تھے۔

شرعی احکام کی بجا آوری سے بھی باطن کا تزکیہ ہوتا ہے اور وہ سب اہلِ ایمان کے لیے عام ہے اسی لیے اسے دورۂ ایمان کہا جاتا ہے۔

حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس دورۂ شریعت کو کسی جگہ تغیر نہیں قرار دیا ہے۔ اسے دورہ یا رنگ ہی کہا ہے۔ کیونکہ وہ خوب واقف تھے کہ وہی اسلامی اصل شریعت و طریقت ہے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ و تابعین کرام کے قرونِ خیر میں جاری رہی۔ اس میں تغیر و تبدل کبھی واقع نہیں ہوا۔

تغیر و تبدیلی کا عمل اس وقت شروع ہوا جب بقولِ حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ متقشف صوفیہ نے شریعت کے

احکام و قیود کی خلاف ورزی کی اور اپنے اپنے انحرافات پیدا کر لیے۔ ان میں سے ایک تجرید الٰہی اور ترکِ دنیا کا خیال و عمل تھا۔ انہوں نے صرف اللہ کی عبادت، اس کے مراقبہ، ذکر و فکر اور دوسرے اعمال و اشغال میں اپنے آپ کو لگا لیا اور دنیا ترک کر کے اپنی اپنی خانقاہوں میں جا بسے اور اجتماعی اسلامی زندگی کے تمام مراتب کو فراموش کر دیا۔ یہ راہبانہ طرزِ زندگی اسلامی نہیں حضرت شاہ نے تفہیمات الٰہیہ اور دوسرے رسائل و کتب میں اس صوفیانہ تجاوز پر سخت نقد کیا ہے کہ وہ باعثِ خرابی تمدن ہے۔ متقشفین کے انحراف و تجاوزات کو دور کرنے اور کتاب و سنت پر طریقت و تصوف کی تجدید کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت کے مطابق حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کو بھیجا اور انہوں نے سنتِ سنیہ پر اسکی تجدید کی اور ایسی مضبوط و صالح بنیاد ڈال دی کہ بعد کے تمام صوفیہ کرام اور اہلِ طریقت ان کے طریقہ کے ہی پابند ہو گئے، اور جو منحرف رہے وہ اصل ڈگر سے بھٹک گئے تھے حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس زمانہ سے دورۂ طریقت کے آغاز کا ذکر کیا ہے کہ اس سے پہلے کا رنگ ودورہ دورۂ شریعت ہے۔ جو اس دوسرے دورہ یا رنگِ تصوف کے ساتھ ساتھ باقی اور جاری ساری رہا۔ یہ دورۂ طریقت اصلاً بعد کے تمام ادوار کو محیط ہے۔ کیونکہ بعد کے تمام صوفیائے کرام اور خاص کر تمام سلاسلِ تصوف اور ان کے بانیانِ عظام طریقۂ جنیدی کے پیرو ہیں۔ اسی لیے حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے مشہور ترین صوفیہ اور ان کے سلاسل و طرق کا ذکر نہیں کیا کہ ان کا رنگ ودورہ خالص رنگ ودورہ جنیدی ہے۔

حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے بہت صراحت کے ساتھ کہا ہے کہ اس دوسرے دورۂ/رنگ طریقت میں دو طبقات تھے: ایک عام اہلِ کمال جو دورۂ شریعت کے طریقہ پر قائم رہے اور ظاہر ہے کہ جو اہلِ کمال نہ تھے، عوام تھے، وہ اسی پر قائم ودائم رہنے پر مجبور تھے کیونکہ حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے فلسفۂ حکمت و طریقت کے مطابق افراد و طبقات کو مختلف استعداد میں دی جاتی ہیں جو ان کی طبائع کے مطابق اور ان سے ہم آہنگ ہوتی ہیں اور ان طبعی و فطری استعداد کے مطابق ہی وہ احکامِ شریعت و مراتب طریقت کو بجا لاتے ہیں۔ حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے حجۃ اللہ البالغہ اور بعض دوسری کتب و رسائل میں انسانوں کی استعداد کے فرق سے بحث کی ہے۔

دورۂ طریقت اور رنگِ تصوف کے دوسرے دور میں عوام اور عام اہلِ کمال کے دوش بدوش ان سے بلند تر ہمت والا طبقہ اہلِ کمال کے خواص کا تھا اور یہ دوسرا خاص طبقۂ اہلِ کمال اس خاص رنگِ تصوف میں رنگا گیا تھا اور وہ ان کی خاص استعدادوں کے مطابق بھی تھا۔ اسی لیے وہ ریاضات شاقہ کر سکے اور مستقل ذکر و فکر کے ہو رہے اور ان کی وجہ سے ان کو وہ کیفیت نصیب ہوتی کہ تعلق باللہ کی نسبت مل گئی اور وہ صف محبتِ الٰہی میں سرشار ہو کر عبادت کرتے رہے اور کسی لالچ یا ڈر سے عبادت و ریاضت نہیں کرتے تھے۔ ان کی اس ہمہ

وقتی عبادت وریاضت سے ان کی توجہ غیر کامل سہی نصیب ہوئی۔اس رنگ ودورۂ طریقت کے زمانے میں جس کو حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے ''زمان شرح الصدر'' قرار دیا ہے، بہر حال طاعت غالب رہی اور وہ اعمال واشغال سے غافل نہیں ہوئے۔تجزیۂ بحث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں تین طرح کے افراد وطبقات تھے:

ایک عام اہلِ کمال جو صرف شریعت پر قائم رہے۔

دوسرے عوام الناس جن کی طریقت صرف شریعت کی بجا آوری تھی۔

تیسرے خواصِ کمال جو ریاضات شاقہ، ذکر وفکر مستقل میں ہمہ وقتی اور مستقل طور سے معروف ہو گئے۔(۱۶)

تیسرے رنگ ودورۂ طریقت میں خاص رنگ کا ظہور ہوا اور وہ اعمال واشغال سے گزر کر جذب تک پہنچ گئے اس جذب کے عالم میں ان پر جو حقائق کھلے ان کی بنا پر ان کو ذات واجب الوجود اور قیوم حی لا یموت اور تمام دنیا پر متصرف ذات واحد کا عرفان نصیب ہو گیا مگر اس کی وجہ سے وہ اوراد و وظائف، عبادات و ریاضات اور اعمال واشغال سے بیگانہ ہو کر مجذوب بن گئے۔مسلم امت میں یہ نیا طبقہ تھا جو وجود میں آیا۔ اس کے وجود کے ساتھ سابقہ طبقات بھی ہوئے۔

اوّل ''عوام الناس جو ہر زمانے اور ہر دورے میں شریعت ہی کے پابند رہ کر طریقت کے فیوض اُٹھاتے رہے۔وہ اکثریت میں تھے۔''

دوم ''اہلِ کمال کے عوام جو شرعی اوامر واعمال پر ٹھہرے رہے۔صوفیہ میں بھی یہ اکثریت میں ہی تھے۔''

سوم ''خواص اہلِ کمال جو باطنی احوال وکیفیات کو اپنا نصب العین بنا کر ریاضات وعبادات واعمال و اشغال کرتے رہے اور ان کی تعداد اقلیت قلیلہ تھی۔اس طرح اس دورۂ طریقت ورنگِ تصوف میں چار قسم کے افراد وطبقات بن گئے۔''

چوتھے دورۂ طریقت ورنگِ تصوف میں اہلِ کمال کے خواص یعنی اخص الخواص حقائقِ تصوف کی تحقیق وتدقیق میں لگ گئے یہ خالص فلسفیانہ تصوف کا دورہ ورنگ ہے جس کے آثار وعلائم کچھ پہلے ابھرنے لگے تھے لیکن جن کو مرتب ومدون فلسفہ کی صورت میں شیخ اکبر ابنِ عربی رحمۃ اللہ علیہ نے ڈھالا اور وہ فلسفہ وحدۃ الوجود کے نام سے مشہور ومعروف ہوا۔ وہ خالص فلسفیانہ بحث ہے۔تصوف سے اس کا تعلق صرف اس بنا پر ہے کہ عظیم صوفیائے کرام نے زمانے کے احوال اور تقاضوں سے فلسفیانہ مباحث سے دل چسپی لی اور وجودِ باری تعالیٰ، اس کے اثبات وظہور اور اس کی وحدت وقیومیت سے بحث کرنے پر مجبور ہوئے اور اس طرح وہ فلسفہ میں

ڈھل گیا۔ (۱۷)

اس چوتھے دورہ و رنگِ تصوف میں نئے طبقہ صوفیہ کے وجود میں آجانے سے امت میں پانچ طبقات بن گئے:

۱۔ عوام الناس / عام اہلِ ایمان کے افراد و طبقات جن کی استعدادیں صرف شریعت کے احکام کی بجا آوری پر مجبور ہیں۔

۲۔ عام / عوام اہلِ کمال جو دوسرے دورہ سے برابر ہر دورہ و دور میں شرعی احکام و اوامر اور نواہی پر قائم ہیں۔

۳۔ خواصِ اہل کمال جو جذبِ دوروں کے سبب ریاضاتِ شاقہ اور مستقل اعمال و اشغال میں لگنے پر مجبور ہوئے۔

۴۔ اہلِ کمال کے اخص الخواص جو حقائق کی معرفت کے سبب اعمال و اشغال سے بیگانہ اور خالص مجذوب بن گئے۔

۵۔ پانچواں طبقہ وحدۃ الوجودی ہے جو فلسفیانہ تصوف کے زیرِ اثر حقائق تصوف، تنزلاتِ خمسہ / ستہ اور وجودِ باری سے کائنات کے ظہور اور کائنات سے ذات واجب الوجود سے اس کے تعلق کے فلسفہ میں الجھ کر رہ گیا۔ اس فلسفہ کے سمجھنے اور بیان کرنے والے اب تک اکابر صوفیہ میں بھی معدود چند ہوئے ہیں۔

محاکمہ حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ میں ان چاروں دورات و رنگ ہائے تصوف کے اہلِ کمال اکابر کو ان کے اعمال و احوال کے اختلاف کے باوجود ایک ہی سطح پر رکھا ہے اور ان سب کو مقبول عنہ اللہ بتایا ہے تاہم یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ ان کے اقوال و احوال کو ان کے زمانے کے ذوق کے مطابق جانچنا چاہیے۔ حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ تطبیقی ذہن تمام مسالک و مذاہب کی حقانیت، اللہ و رسول کی جناب میں مساوی طور سے مقبولیت اور دنیا میں ان کی یکساں قسم کی حیثیت کے معاملات میں ہر جگہ کارفرما نظر آتا ہے اور اس کا واضح ذکر وہ ہمعات، فیوض الحرمین، القول الجمیل، تفہیمات الٰہیہ، حجۃ اللہ البالغہ وغیرہ میں برابر کرتے ہیں۔ وہ خود بھی تمام مسالک و سلاسل کے جامع بھی تھے۔ (۱۸)

ولی اللٰہی تصوف کا بطورِ خاص اور نظریہ دورات / رنگہائے تصوف کا بالعموم امتیاز یہ ہے کہ وہ شریعت کی بالادستی اور فوقیت ہی کو اجاگر نہیں کرتا بلکہ اس کو تمام تر جہات و ابعاد میں طریقت پر حاکم، محیط اور فیصل بھی بتاتا

ہے اور یہ کوئی خاص ان کا مسلک نہیں ہے بلکہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے قبل کے زمانے کے صوفیہ کرام کے زمانے سے برابر متفقہ چلا آ رہا ہے تمام اکابر صوفیہ اور حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ بطورِ خاص طریقت پر شریعت کی حاکمیت اور قیومیت کا عقیدہ وایقان رکھتے اور ظاہر کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ ان صوفیہ کرام کے لیے بھی جن کا خیالِ خام تھا کہ ان سے تکلیفِ شرعی، احکامِ شریعت کی بجا آوری کی پابندی اُٹھالی گئی ہے۔ احکامِ شریعت میں سے صرف فرائض وواجبات کو ہی نہیں بلکہ نوافل ومستحبات تک لازمی اور ضروری قرار دیتے ہیں۔ سلوک کی دو قسموں کی بحث ہو یا سعادتین کے حصول کے دوگانہ طریقوں کا نظریہ یا سیدھا سادہ عملی تصوف کا نظریہ وعمل، ہر جگہ حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے شریعت کی بالادستی، حاکمیت، فرضیت اور ہمہ گیری کا بلیغ اظہار کیا ہے اور طریقت وتصوف کی محکومیت اور جزویت کا۔ کیونکہ ان کے عقیدہ وایقان میں زندگی، اجتماعِ بشری اور فرد وشخص کی دنیاوی اور اخروی سعادتوں کا نظام وسامان صرف شریعت میں ہے۔

اسی محکم عقیدہ اور مضبوط ایمان کا فکری اور علمی اظہار ان کا نظریہ دوراتِ تصوف وطریقت ہے۔ اس میں حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ کا عظیم ترین کارنامہ یہ ہے کہ دورۂ شریعت اور رنگِ کتاب وسنت کو طریقت وتصوف کا اولین، ناگزیر اور ہمہ جہت دورۂ ورنگ اور اصل الاصول قرار دیا ہے۔ اس سے عوام وخواص، اہلِ کمال کے ادنیٰ، اوسط اور اعلیٰ طبقات، علماء وفقہاء، صوفیہ ومشائخ حتیٰ کہ انبیائے کرام علیھم السلام اور ان کے سردار آقائے نامدار سید المرسلین وخاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم بھی کسی جہت میں بھی مستثنیٰ نہ تھے جبکہ دوسرے تمام دوراتِ طریقت میں حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ صرف ''اہلِ کمال کے خواص'' کا رنگ بتاتے ہیں۔ اہلِ کمال کے عوام بھی اس سے رنگے ہوئے نہ تھے حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے قرب الفرائض اور قرب النوافل کے اپنے نظریہ ومبحث میں واضح کیا ہے کہ قرب الفرائض واجب ہے اور مؤخر الذکر صرف نفل منطق وعقلِ سلیم کے علاوہ اسلامی تاریخ و تہذیب کے تمام واقعات اور خاص تصوف وطریقت کے سارے شواہد یہ ثابت کرتے ہیں کہ دورۂ شرح الصدر، زمانِ جذب وقرب النوافل اور دورۂ حکمت وفلسفہ صرف خواص بلکہ اخص الخواص افراد وطبقات کا رنگِ تصوف ہو۔ عام صوفیہ ومشائخ اور ان کے مریدوں اور سالکوں کا رنگِ تصوف حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے سے سیدھا سادہ عملی تصوف رہا ہے۔ حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اس نظریہ سے ثابت کیا ہے کہ سب عوام وخواص کا اصلی رنگ طریقت صرف شریعت ہے اور اس کے احکام کی بجا آوری سے تمام باطنی تقاضے پورے ہو جاتے ہیں اسی سے تزکیۂ نفس ہوتا ہے اور اسی سے احوال ومقامات ملتے ہیں اور یہی ان کے نظریہ کی جان ہے۔

ooo

حوالہ جات

۱۔ مذکورہ بالا کے علاوہ کتب شاہ جیسے انفاس العارفین، تفہیمات الٰہیہ، لمعات، القول الجمیل، الانتباہ، سطعات وغیرہ یا نیز کتاب خاکسار شاہ ولی اللہ کے مآخذ۔۔۔ کتب وشخصیات، پھلت ۲۰۱۰ء: مناظر احسن گیلانی، تذکرۂ حضرت شاہ ولی اللہ، حیدرآباد دکن، ۱۹۴۸ء: محمد رحیم بخش دہلوی، حیات ولی، لاہور ۱۹۷۲ء: اطہر عباس رضوی، شاہ ولی اللہ اینڈ ہز ٹائمس (انگریزی) کینبرا، ۱۹۸۰ء وغیرہ

۲۔ اس نظریہ شاہ کے اکثر وبیشتر اہلِ قلم نے صرف ھمعات کو ماخذ بنایا ہے اور اس میں بھی وہ مختلف دورات اور رنگوں کا تجزیہ نہیں کر سکے مثلاً ملاحظہ ہو:

محمد عبدالحق انصاری، مجددین امت اور تصوف، نئی دہلی ۲۰۰۹ء بالخصوص ۵۴۔۔۔۵۵ (حاشیہ ایں صرف ھمعات کا حوالہ ہے۔)

۳۔ ہمعات اردو ترجمہ محمد سرور لاہور ۱۹۴۳ء، ۴۸،۴۸،۴۸۔۔ ۱۵۳ نے ان چاروں دورات اور رنگوں کا ترجمہ دور سے کیا اور اپنی طرف سے ہر دور کی سرخی لگا دی ہے۔ ترجمہ کے اسقام ونقائص اس کے علاوہ ہیں۔ اصل ہمعات فارسی مرتبہ نورالحق علوی وغلام مصطفیٰ قاسمی، شاہ ولی اللہ، اکادمی حیدرآباد سندھ ۱۹۶۴ء، ۱۶۔۔۔۲۰ سے اس کا موازنہ حقیقت کو واضح کر دیتا ہے۔ نیز ملاحظہ ہو بحث آئندہ

۴۔ مثلاً پروفیسر محمد عبدالحق انصاری کی بحث مذکورہ بالا کے علاوہ متعدد ثانوی مآخذ وکتب کے مؤلفین کرام جن کا اوپر ذکر آچکا۔

۵۔ شاہ ولی اللہ، ہمعات، اردو ترجمہ محمد سرور، سندھ ساگر اکیڈمی لاہور ۱۹۶۴ء، ۱۹۹۹ء: مکتبہ رحمانیہ دیوبند ۱۹۶۹ء: محمد عبدالحق انصاری، مذکورہ بالا، ۵۹۔۔۔۶۰ کا ترجمہ مختلف ہے۔ حوالے دیوبند کے طبع کے ہیں: ۷۰۔۷۷

۶۔ اصطلاحاتِ تصوف کے آئندہ بحث کے علاوہ ملاحظہ ہو: ابوالقاسم قشیری، رسالہ قشیریہ، اردو ترجمہ اسلام آباد ۱۹۷۰ء: ابوطالب مکی کی قوت القلوب، مطبعہ یمینیہ مصر ۱۳۰۱ء وغیرہ کتب حدیث میں اسے حدیث جبریل کہا گیا ہے: ملاحظہ ہو: کتاب خاکسار، وحی حدیث نئی دہلی ۲۰۰۴ء، ۱۸۶۔۱۸۸ بحوالہ مسلم کتاب الایمان، باب بیان الایمان والاسلام والاحسان یا نووی، المنہاج، ۱/۱۳۱ مابعد

۷۔ شاہ ولی اللہ، التفہیمات الالٰہیہ، مرتبہ غلام مصطفٰی قاسمی، اکادیمیہ الشاہ ولی اللہ دہلوی، حیدرآباد سندھ، ۱۹۹۷ء، ۱/ ۱۰۳/ ایک اور تفہیم میں حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ متقشف صوفیہ نے صرف اللہ سے لو لگالی اور معیشت کی تلاش ترک کردی اور دوسرے انحرافات پیدا کیے تو سید الطائفہ جنید بغدادی آئے اور انہوں نے اس طریقہ کو سنت پر استوار کیا اور اس کی تہذیب کی اور خالص بنایا۔ لہٰذا حضرت جنید کا طریقہ خیر محض ہے اور اللہ نے اس میں برکت پھونک دی اور اس پر شمار سے زائد لوگوں کو جمع کر دیا (تفہیمات الٰہیہ ۱/ ۲۷۲۔ ۲۷۳: تفہیم: ۶۹

۸۔ (تفہیمات الٰہیہ ۲/ ۲۱۷ مابعد: ۲/ ۱۹۴ مابعد۔

۹۔ (تفہیمات الٰہیہ مذکورہ بالا: ہمعات مذکورہ بالا: تفہیم: ۶۹ نیز تفہیم: ۱۶۱، ۲/ ۱۶۱: اس کو دورہ/ زمان شرح الصدر قرار دیا نیز ۲/ ۱۹۲۔ ۱۹۴ مابعد۔

۱۰۔ ہمعات اردو ترجمہ مذکورہ بالا

۱۱۔ مذکورہ بالا، ۱/ ۱۰۴

۱۲۔ مزید شرح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیمات ۲/ ۱۹۲۔ ۱۹۴ مابعد۔

۱۳۔ ہمعات مذکورہ بالا، ۷۵۔ ۷۶

۱۴۔ ہمعات مذکورہ بالا ۷۶۔ ۷۷

۱۵۔ تفہیمات الٰہیہ ۱/ ۱۰۵/ ۱۰۶: حدیث مذکورہ بالا خطبۃ حجۃ الوداع میں یوم النحر کو ارشاد فرمائی تھی۔ آیتِ قرآنی: سورۃ بقرہ

۱۶۔ یہ حقیقت تاریخی واقعات اور صوفی روایات سے بھی ثابت ہوتی ہے کہ صرف کبار صوفیہ اور ان کے چیدہ مریدین و سالکین ہی کل وقتی ہوتے تھے جو زندگی سے کٹ کر صرف خانقاہوں کے ہو رہتے ہیں۔ ورنہ بیشتر بلکہ غالب اکثریت ان کی ریاضات شاقہ کے علاوہ دوسرے فرائض زندگی ادا کرتے ہیں۔ عوام، عام اہلِ کمال کا تصوف و طریقت جز وقتی ہی ہوتا ہے کہ وہ فرائض و واجبات کے ساتھ ذکر و فکر اور اوراد و وظائف بھی ادا کر لیتے ہیں۔

۱۷۔ وحدۃ الوجود پر حضرت شاہ کی بحث کے لیے ملاحظہ ہو: مکتوب مدنی، جس کا اردو ترجمہ محمد حنیف ندوی نے لاہور سے چھاپا ہے:
وہ اصلاً التفہیمات الالٰہیہ میں شامل ہے۔ شیخ اکبر کے فلسفہ وحدۃ الوجود کی ایک تعبیر شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی نے وحدۃ الشہود کے نام سے کی اور اسے زیادہ اسلامی قرار دیا جانے لگا مگر حضرت شیخ ولی اللہ کے مطابق دونوں ایک ہیں اور یہ نزاع لفظی ہے: محمد عبدالحق انصاری مذکورہ بالا۔

۱۸۔ چار اہم ترین سلاسل تصوف: نقشبندیہ، قادریہ، سہروردیہ اور چشتیہ کے علاوہ حضرت شاہ کا تعلق و ربط باطنی شاذلی، شطاری، مداری، مدینی وغیرہ سلاسل کے علاوہ طریقہ اویسیہ سے بھی تھا۔ القول الجمیل میں حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ان انتخابات کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔

OOO

میر محمد نعمان بدخشی رحمۃ اللہ علیہ
اولین خلیفہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ

محمد اقبال مجددی ☆

Abstract:

Mir Nauman Badakhshi was a prominent disciple and first spiritual successor of Sheikh Ahmed Sirhindi Mujaddid Alif Sani who was an eminent saint of the Naqshbandia order. He was a Hussaini Sayyed. Mir Abdul Hamid was grandfather of Mir Nauman and known as great personality in Tasawwuf and Mir Shamas-ud-Din was his son and he was the father of Mir Nauman Badkhshi. Mir Nauman took the job of purifying the Muslim society of un-Islamic tendencies by sending a number of his disciples in all directions to preach the true Islam. He trained them for having Ittiba-e-Sunnah and follows the examples of the Holy Prophet (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) and Sunnah in all fields of life. This work was vigorously pursued in Kashmir, India and other neighboring cities. Mir Nauman Badakhshi till the last breath of his life continued with the propagation of Islam and teaching of Tasawwuf.

Key Words:

Prominent, Spiritual Successor, Naqshbandia, Hussaini Sayyed, Purifying, Muslim, Society, Un-Islamic, Tendencies.

☆ سابق صدر شعبہ تاریخ، اسلامیہ کالج، لاہور

حضرت میر محمد نعمان بدخشی حضرت خواجہ باقی باللہ (۹۷۲۔۱۰۱۲ھ/ ۱۵۶۴۔۱۶۰۳ء) کے فیض یافتہ،حضرت مجددالف ثانی شیخ احمد سرہندی (۹۷۱۔۱۰۳۴ھ/ ۱۵۶۳۔۱۶۲۴ء) کے اولین خلیفہ اور مکتوب الیہ تھے،ہزارہامریدین نے ان سے روحانی تربیت حاصل کی۔

اجداد:

آپ حسینی سید تھے،پوراشجرۂ نسب اس طرح ہے:

''میر محمد نعمان بن میر شمس الدین ملقب بہ میر بزرگ بن میر جلال الدین حسن بن میر عبدالحمید بن صاحب الوقت مولی المرتضیٰ نقیب النقباء فخر النور شمس الدین ملھان بن سعید المغفور محمد ابنِ علی یار بن محمد بن ہادی بن سعید مجدالدین بن ابی علی ابنِ ابی سماع بن زبیر بن حسین بن احمد بن علی ابوعبداللہ احمد بن محمد اعرج بن محمد بن موسیٰ المرقع بن الامام ابوجعفر محمد الجواد بن امام علی رضا بن امام موسیٰ کاظم بن امام جعفر صادق بن امام محمد باقر بن امام زین العابدین بن امام ابی عبداللہ امیر المومنین حسین بن امیر المومنین علی الونی ابنِ عم النبی وفاطمۃ الزہرابنتِ سیدالکونین محمد النبی اسلامی العربی الہاشمی علیہ آلہ الف الف صلوۃ۔''(۱)

میر عبدالحمید:

آپ کے پردادا میر عبدالحمید ایک متقی بزرگ تھے،ان تمام بزرگوں کا تعلق افغانستان کے مشہور مردم خیز خطہ بدخشان سے تھا،میر عبدالحمید بدخشاں سے حج کے لیے اور وہاں سے براہِ راست ہندوستان آ کر کشمیر میں مقیم ہوگئے،آپ کشمیر میں اسلام کے مبلغ اول شرف الدین ملقب بہ بلبل شاہ۔(۲)

(۷۲۷ھ/ ۱۳۲۶ء) کے ہاں حاضر ہوئے،(۳) ادھر خواب میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ میرا فرزند میر عبدالحمید تمہارے پاس آیا ہے تو قیر کریں تو انہوں نے آپ کو بہت ہی احترام سے رکھا اپنی دختر نیک اختر سے نکاح کر دیا،(۴) خواجہ محمد ہاشم کشمی (۵) اور ملا بدرالدین سرہندی (۶) نے لکھا ہے کہ سید بلبل شاہ میر عبدالحمید کے اجداد میں سے تھے لیکن خاندانی روایت میں ایسا کچھ نہیں ہے بلکہ ان کے مکہ مکرمہ سے کشمیر میں ورود اور سید بلبل شاہ کا اپنی دختر سے عقد کا ذکر ملتا ہے ہم نے اس روایت کو خاندانی روایت کے باعث ترجیح دی ہے۔ میر عبدالحمید کشمیر میں ہی مقیم ہو گئے ان کا وہیں وصال ہوا اور مدفون بھی وہی ہیں۔(۷) گویا اس طرح سید بلبل شاہ کشمیری میر محمد نعمان بدخشی کے جد مادری ہو گئے۔

میر عبدالحمید کی اولاد میں سے ایک صاحبزادے میر جلال الدین تھے،ظاہر ہے کہ ان کی ولادت کشمیر میں ہی ہوئی ہوگی۔ موصوف علماء اتقیاء (۸) میں شمار کیے جاتے تھے۔(۹)

میر شمس الدین بدخشی انہی کے فرزند گرامی تھے جن کے صاحبزادے حضرت میر محمد نعمان بدخشی تھے۔

میر شمس الدین بدخشی معروف بہ میر بزرگ:

معلوم ہوتا ہے کہ اپنے والد میر عبدالحمید کے وصال کے بعد ان کے فرزند میر جلال الدین کشمیر سے واپس اپنے آبائی خطہ بدخشان چلے گئے اور وہیں توطن اختیار کر لیا، بدخشان کے مضافاتی قصبات میں سے ایک مشہور علاقہ کشم (۱۰) ہے، جہاں امیر جلال الدین کے ہاں ایک فرزند میر شمس الدین متولد ہوئے (۱۱) اور وہیں ان کی پرورش بھی ہوئی۔ (۱۲)

خاندانی تذکرہ مفتاح العارفین میں میر بزرگ کا نام میر شمس الدین محمد یحییٰ مکی ثم ہروی ثم بدخشانی چشتی درج ہے (۱۳) گویا موصوف خود یا ان کے والد گرامی پہلے مکہ مکرمہ پھر ہرات اور آخر میں بدخشان میں رہے، میر بزرگ عالم عامل اور متقی تھے علوم اسلامیہ کے علاوہ جفر اور تکسیر میں بھی مہارت رکھتے تھے، وہ مسلک حنفی کے پیروکار تھے۔ (۱۴)

میر بزرگ کو سلسلہ عشقیہ (شطاریہ) کے ایک صوفی سے عقیدت تھی، جو جوتا فروش تھے، شیخ بدرالدین سرہندی نے کتاب سنوات الاتقیاء میں ان کی بعض کرامات بیان کی ہیں (۱۵) میر بزرگ کو انہی موزہ دوز صوفی سے خلافت بھی حاصل تھی۔ (۱۶)

میر بزرگ کو حضرت قاسم شیخ کرمینی (۱۷) سے بھی بڑی عقیدت تھی (۱۸) جو حضرت خواجہ عبیداللہ احرار کے خلیفہ مولانا نوری خراسانی اور مخدوم اعظم مولانا خواجہ احمد کاسانی کے فیض یافتہ تھے۔ میر بزرگ نے اپنی ایک کتاب میں شیخ قاسم کرمینی کا نام سنہری حروف میں لکھا جب انہوں نے وہ کتاب دیکھی تو فرمایا کہ رب کریم تمہیں بھی اتنی ہی عزت دے جو تم نے اس فقیر کو دی ہے۔ (۱۹) کابل کا حاکم مرزا محمد حکیم (ف ۹۹۳ھ/ ۱۵۸۵ء) جو علماء وصوفیہ سے بڑی عقیدت رکھتا تھا آپ کو بہت ہی محبت بھرا خط لکھ کر کابل آنے کی دعوت دی، (۲۰) خاندانی ماخذ مفتاح العارفین میں ہے کہ آپ تنہا کابل گئے تو مرزا حکیم نے اپنی دختر کے ساتھ نکاح کی پیش کش کی تو آپ وہیں کابل میں ہی مقیم ہو گئے۔ (۲۱)

مرزا محمد حکیم کے انتقال کے بعد اکبر بادشاہ نے کابل کی نگرانی کے لیے مشہور ہندو راجہ مرزا مان سنگھ کو بھیجا اور پھر جلد ہی کابل اس کی جاگیر میں دے دیا گیا (۲۲) جس سے میر بزرگ بہت دل برداشتہ ہوئے اور اپنی موت کی دعا کی جو قبول ہوئی اور آپ کا ۹۹۴ھ کو وصال ہو گیا۔ (۲۳) وہیں کابل میں دفن کیے گئے۔ (۲۴)

ہمیں اس وقت تک یہ بات مصدقہ طور پر معلوم نہیں ہے کہ میر بزرگ نے میرزا حکیم کی اپنی دختر کے آپ کے عقد میں دینے کی جو پیش کش کی تھی وہ آپ نے قبول کی یا نہیں، خاندانی روایت میں صرف پیش کش کا ذکر ہے۔ (۲۵)

جب کہ شواہد اس کے برعکس ہیں کہ مرزا محمد حکیم کی بیٹی کابلی بیگم، مرزا شاہ رخ بن مرزا ابراہیم بن مرزا سلیمان (والی بدخشان) کے عقد میں تھی، مرزا شاہ رخ کا ۱۰۱۶ھ/ ۱۶۰۷ء کو اجین میں انتقال ہو گیا تھا جب کہ میر بزرگ کا انتقال تو ۹۹۴ھ کو ہوا، ممکن ہے یہ مرزا محمد حکیم کی کوئی دوسری بیٹی ہو جس کے ساتھ عقد کی پیش کش ہوئی یا میر بزرگ کے انکار پر کابلی بیگم مرزا شاہ رخ کے نکاح میں آئی ہو۔

میر بزرگ کے اس رسالہ کی تفصیلات بھی نہیں ملتیں جس میں انہوں نے اپنے مرشد شیخ قاسم کرمینی کا نام سنہری حروف میں لکھا تھا، ممکن ہے یہ رسالہ انہوں نے اپنے شیخ کے مناقب ومعارف پر تالیف کیا ہو۔

میر بزرگ کی اولاد:

میر بزرگ کے چار فرزند تھے، انہوں نے عہد کیا تھا کہ میرے ہاں جو بھی بیٹا ہوگا اُسے نبی کریم ﷺ کے اسم گرامی سے موسوم کروں گا چنانچہ ان کے فرزندوں میں جلال الدین محمد، سعد الدین محمد اور ضیاء الدین محمد ہوئے، میر محمد نعمان خود بیان کرتے ہیں کہ میری ولادت کا وقت تھا اور میری والدہ تین چار ماہ کے حمل سے تھیں تو میرے والد نے خواب میں حضرت امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابت کو دیکھا جو فرما رہے تھے کہ تمہارے ہاں فرزند تولد ہوگا اس کا نام میرے نام پر رکھنا، چنانچہ جب میں پیدا ہوا تو میرا نام محمد نعمان رکھا گیا۔(۲۶)

میر بزرگ کے فرزند کلاں میر جلال الدین محمد پہلے ہی حضرت خواجہ باقی باللہ سے منسلک تھے اور جب حضرت خواجہ امکنہ سے خلافت یاب ہو کر دہلی میں قلعۂ فیروزی کی جامع مسجد میں مقیم اور دعوت وارشاد میں مصروف ہوئے تو میر جلال الدین، وہاں کی جامع مسجد کے خطیب وامام تھے، وہ بھی حضرت خواجہ کی خدمت میں بیعت ہوئے موصوف اپنے جد مادری میر بلبل شاہ کشمیری کی طرح بہت ہی خوش الحانی سے قرأت کرتے تھے کہ سامعین پر رقت طاری ہو جاتی تھی، انہوں نے ہی میر محمد نعمان کو حضرت خواجہ سے منسلک ہونے کی ترغیب دی تھی۔(۲۷) میر جلال الدین محمد سمرقندی، حضرت خواجہ سے خلافت یاب تھے اور ۱۰۳۷ھ/ ۱۶۲۷ء کو ان کا وصال ہوا۔(۲۸)

میر محمد نعمان بدخشی:

میر محمد نعمان بدخشی کے مرید وہم وطن خواجہ محمد ہاشم کشمی نے لکھا ہے کہ ہمارے مرشد کی سمرقند میں حدود ۹۷۷ھ/ ۱۵۶۹ء کو ولادت ہوئی،(۲۹) شیخ بدرالدین سرہندی اور میر محمد نعمان کے فرزند میر عبدالفتاح نے بھی یہی سنہ دیا ہے، ''شیخ جنید'' مادۂ تاریخ ولادت ہے۔(۳۰)

میر محمد نعمان نے سمرقند کے علمی ماحول میں پرورش پائی، بچپن سے ہی طبع عالی روحانیت کی طرف راغب تھی فرماتے ہیں: فقراء کی خدمت میں جا کر مراقبات کرتا جس سے ''فکر و حیرت'' کا مجھ پر غلبہ رہنے لگا، نوجوانی میں ہی بلخ کے بزرگ امیر عبداللہ بلخی عشقی کی خدمت میں گیا تو ان کی بشارت نے انابت کی (۳۱) حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ بھی اپنے ایام طلبِ شیخ میں انہی حضرت امیر عبداللہ بلخی کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ان سے مصافحہ کرتے ہی ایسی نعمت غیر مترقبہ حاصل ہوئی کہ جس کی برکات کے متعلق آپ نے لکھا ہے کہ تا قیامت رہیں گی (۳۲) اسی ''طلب'' میں میر محمد نعمان ہندوستان آئے تو حضرت خواجہ کی طرح تلاش شیخ میں پھرتے رہے اور ''وفور شوق'' میں کئی درویشوں سے ملے۔ پھر خوش نصیبی اور توفیق الٰہی سے آپ کی حضرت خواجہ باقی باللہ سے ملاقات ہوگئی تو پھر سب کچھ وہیں مل گیا۔ (۳۳)

اس سے پہلے میر محمد نعمان نے حاجی عبدالرحمٰن رمزی بدخشی سے مصافحہ کیا تھا جو کہ شیخ سعید معمر حبشی کی وساطت سے حضور نبی اکرم ﷺ سے واصل ہوتا ہے، یہ مصافحہ حضرت خواجہ باقی باللہ، حضرت مجدد الف ثانی، شیخ یعقوب صرفی کشمیری، حاجی محمد خبوشانی، شیخ تاج الدین سنبھلی اور خواجہ حسام الدین احمد نے بھی کیا تھا۔ (۳۴)

ملازمت:

آپ کے فرزند میر عبدالفتاح نے لکھا ہے کہ جب حضرت خواجہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ذکر و مراقبہ نقشبندیہ کی تلقین کی، فرمایا:

> ''من دراں زمان نوکر بادشاہ بودم و حضرت اخوی اعزی مظہر جود و کرم میر جلال الدین ہمیشہ می فرمودند کہ بابا مارا تو چشم داشت دیگر بود و تو خود را بحرک دنیا الودہ چوں من مرید حضرت خواجہ شدم، بخدمت اخوی آمدہ عرض نمودم کہ الحال ترک نوکری کردہ ام ایشاں بسیار خوش وقت شدند۔''(۳۶)

شیخ بدر الدین سرہندی نے جنہیں میر محمد نعمان کی خدمت میں مصافحہ مذکورہ کی سعادت بھی حاصل تھی لکھا ہے کہ:

> ''خدمت میر ترک نوکری و علائق دنیوی نمودہ۔۔۔''(۳۷)

یہاں دونوں تذکرہ نویسوں نے نوکری کی نوعیت نہیں بتائی، آپ کی یہ ملازمت چونکہ حضرت خواجہ باقی باللہ (ف ۱۰۱۲ھ/ ۱۶۰۳ء) کے حین حیات تھی اس لیے بلا تردد کہا جا سکتا ہے کہ ''نوکر بادشاہ'' سے مراد جلال الدین محمد اکبر بادشاہ (۹۶۳۔ ۱۰۱۴ھ/ ۱۵۵۶۔ ۱۶۰۵ء) ہی ہے، بظاہر اکبر کی ملازمت سے چھٹکارہ حاصل

کرنا بہت مشکل تھا، حضرت خواجہ کے خلیفہ وخادم خاص خواجہ حسام الدین احمد (ف ۱۰۴۳ھ/ ۱۶۳۳ء) نے جس طرح ملازمت سے علیحدگی اختیار کی اور ان کو اس سلسلہ میں حکومتِ وقت کی طرف سے جو صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں ان کا ذکر ہم تفصیل سے زاد المعاد میں کر چکے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میر محمد نعمان کسی بڑے اور قابلِ ذکر عہدہ پر فائز نہیں تھے جس کا ذکر کتب تاریخ میں نہیں کیا گیا(۳۸) تاہم میر صاحب نے وہ ملازمت ترک کر دی اور اپنے بھائی میر جلال الدین کی طرح کثیر اہل وعیال ومتعلقین سمیت حضرت خواجہ کے حضور حاضر ہو گئے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی کے وصال ۱۰۳۴ھ اور پھر شاہ جہان کی تخت نشینی ۱۰۳۷ھ/ ۱۶۲۷ء کے بعد میر محمد نعمان نے شاہ جہان کے اصرار پر اکبرآباد آگرہ کی صدارت کا منصب قبول کر لیا تھا، انہوں نے ایک معاملہ میں میر ابوالعلاء نقشبندی (ف ۱۰۶۱ھ/ ۱۶۵۱ء) کو اپنے دربار میں بھی طلب کیا تھا (کیفیت العارفین ۱۰۔۱۱) جہاں انہیں باطنی کشائش کا پورا ادراک ہونے لگا، اس دوران حضرت خواجہ سے وابستہ ایک امیر (منصب دار) نے حضرت خواجہ کے فقراء کے لیے روزینہ مقرر کرنے کی پیش کش کی تو حضرت خواجہ کے مریدین میں سے کسی نے کہا کہ میر محمد نعمان اپنے کثیر متعلقین کے ساتھ فقر وفاقہ وتنگ دستی میں مبتلا ہیں ان کا روزینہ بھی مقرر کروا دیں لیکن حضرت خواجہ نے فرمایا نہیں نہیں انہیں دنیا کے اس ''چرک'' میں ملوث نہیں کرنا چاہتا جسے سن کر آپ خوش ہوئے اور اسی حالت میں صبر وتوکل کے ساتھ گزر بسر کرتے رہے۔(۳۹) اسی اثنا میں ۱۰۰۸ھ/ ۱۶۰۰ء) کو حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی حضرت خواجہ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے اور پھر جلد ہی حضرت خواجہ نے مریدین کی تعلیم وتربیت ان کے سپرد کر دی اور خود گوشہ نشین ہو گئے، تمام مریدین کو حکم دیا کہ وہ حضرت شیخ کی خدمت میں سرہند جا کر سلوک کی مشق کریں، اس پر میر محمد نعمان کو تردد ہوا اور آپ حضرت شیخ کی خدمت میں نہ گئے، جس پر حضرت خواجہ نے حضرت شیخ کی بہت تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ مجھ جیسے ہزاروں ستارے اس آفتاب میں گم ہیں۔ تاہم آپ نے فرمایا کہ میر اگر نہیں جانا چاہتے تو انہیں میرے پاس ہی رہنے دیں، جہاں آپ کو خواجہ حسام الدین احمد کے ساتھ حضرت خواجہ کی خدمت میں رہنے کی سعادت نصیب ہوئی اور آپ کو ایک شب جب کہ حضرت خواجہ سخت علیل تھے رات جاگ کر گزارنے کا موقع بھی نصیب ہوا جس پر آپ فخر کرتے رہے، حضرت خواجہ کے وصال کے بعد آپ حضرت شیخ کی خدمت میں سرہند حاضر ہوئے اور تکمیل کی۔

حضرت مجدد الف ثانی کے حضور:

میر محمد نعمان نے خود اپنے فرزند میر عبدالفتاح سے بیان کیا تھا کہ جب حضرت خواجہ نے اپنے تمام مریدین کو سرہند جانے کا حکم دیا تو میں ''ہم پیرگی ورعونتہای نفس'' سرہند شریف نہ گیا تو حضرت خواجہ نے فرمایا کہ میر نہیں جانا چاہتے تو نہ جائیں انہیں میرے پاس رہنے دیں۔(۴۰)

حضرت خواجہ نے میر محمد نعمان سے فرمایا کہ میاں شیخ احمد ایک ایسے آفتاب ہیں کہ جن میں ہم جیسے ہزاروں ستارے گم ہیں، اور اولیائے متقدمین میں ان کی مثال کہیں کہیں ہی ملے گی۔(۴۱) حضرت خواجہ کے وصال (۱۰۱۲ھ/ ۱۶۰۳ء) کے بعد جب حضرت مجدد الف ثانی دہلی آئے تو انہوں نے حضرت کو ایک عریضہ لکھا جس میں اپنی شکستہ دلی، غریبی، بے نصیبی اور بے استعدادی کا ذکر کر کے عرض کیا کہ میرے پاس اس کے سوا کوئی اور وسیلہ نہیں ہے کہ میں سید المرسلین ﷺ کی اولاد میں سے ہوں لہٰذا آنحضرت ﷺ کے صدقہ مجھ پر رحم فرمائیے، میر صاحب کا یہ رقعہ پڑھ کر آپ پر رقت طاری ہوگئی اور فرمایا کہ میر صاحب بیدل نہ ہوں ہمارے حضرت خواجہ حاضر ہیں ان شاء اللہ بہتر ہوگا۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ حضرت خواجہ کے اصحاب میں سے میر صاحب کو ہمارے ساتھ خاص مناسبت ہے۔(۴۲) اس طرح آپ نے میر صاحب کو اپنے اہلِ ارادت میں داخل کر لیا اور انہیں اپنے ساتھ دہلی سے سرہند لے گئے جہاں وہ کئی سال آپ کی خدمت میں رہے۔(۴۳)

اس دوران حضرت مجدد الف ثانی پر ایسا ضعف طاری ہوا، معلوم ہوتا تھا کہ آپ کا آخری مرض ہے اور اسی میں آپ کا وصال ہو جائے گا، آپ کو اس حالت میں یہ بھی کشف ہوا کہ خواجگانِ نقشبندیہ کی جو امانتیں میرے پاس ہیں انہیں کسی کو القا کر دی جائیں، جس پر آپ نے توجہ فرمائی تو صرف دو اصحاب اس کے اہل معلوم ہوئے اول آپ کے بڑے صاحبزادے حضرت خواجہ محمد صادق اور دوم میر محمد نعمان بدخشی، چنانچہ آپ نے وہ امانت ان حضرات کے سپرد کر دیں، جن سے ان دونوں حضرات نے اپنی اپنی استعداد کے مطابق افاضہ کیا، رب کریم کے فضل سے اس کے بعد حضرت کو صحت کاملہ نصیب ہوئی، تو آپ نے فرمایا کہ ضعف کے دوران ان نسبتوں کے دوسروں کو عطا کیے جانے کا راز یہ معلوم ہوا کہ بعض ''معاملات و مقامات'' مجھے اسی وقت حاصل ہوتے جب میں وہ نسبتیں تم کو دے دیتا۔(۴۴)

میر صاحب کا روحانی معاملہ ہمیشہ ترقی پذیر رہا، سلوک کی تکمیل کے بعد آپ کو حضرت مجدد الف ثانی نے ۱۰۱۸ھ/ ۱۶۰۹ء کو دعوت وارشاد کے لیے دکن کے مشہور روحانی شہر برہانپور بھیجا۔(۴۵) خواجہ محمد ہاشم کشمی

نے لکھا ہے کہ آپ کو دو مرتبہ برہان پور مرخص کیا، جہاں آپ کا سلسلہ دعوت کامیاب نہیں ہوا کیوں کہ وہاں دو صوفی بزرگ شیخ محمد بن فضل اللہ برہانپوری (ف ۱۰۲۹ھ/۱۶۲۰ء) اور شیخ عیسی جند اللہ (ف ۱۰۳۱ھ/۱۶۲۲ء) پہلے ہی مصروف کار اور بڑے صاحبِ حال وقال بزرگ تھے۔(۴۶) لیکن جب تیسری بار انہیں برہانپور بھیجا گیا تو بڑی کامیابی ہوئی۔ ان کی صحبت کی تاثیر بہت گرم تھی، طالب مرغ بسمل کی طرح تڑپتے اور بے حال ہو جاتے تھے۔(۴۷) روانگی سے پہلے انہوں نے اپنا ایک خواب حضرت کی خدمت میں بیان کیا تھا اور اس کی تعبیر پوچھی تھی جو اس وقت معلوم نہیں ہو سکی تھی بعد میں آپ نے اپنے مکتوب میں اس کی تعبیر بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ آپ کی تکمیل کی طرف اشارہ تھا، اب امید ہے کہ اس علاقے کے دشت وصحرا آپ کے وجود سے منور ہو جائیں گے۔(۴۸) حضرت مجدد الف ثانی کے نام اپنے ایک عریضہ میں میر محمد نعمان نے اپنے کثیر تعداد کے مریدین کا ذکر کرتے ہوئے بعض کے احوال بھی تحریر کیے ہیں۔(۴۹)

جب میر صاحب کے خلاف جہانگیر کے کان بھرے گئے تو اُسے آپ کے مریدین کی کثیر تعداد بھی بتاتے ہوئے کہا گیا کہ اُن کے ایک لاکھ ازبکی سوار مرید ہیں،(۵۰) جس پر جہانگیر نے انہیں دربار میں طلب کیا، بادشاہ کے ساتھ مکالمہ ہوا تو اس دوران آپ کو ہنسی آ گئی جس پر جہانگیر غضب ناک ہو گیا، اس وقت نواب مہابت خان بھی دربار میں موجود تھا اس نے بظاہر جہانگیر کی طرف داری کی جس پر اس نے آپ کو نواب کے حوالہ کر دیا جس پر وہ آپ کو اپنے محل میں لے آیا بہت خاطر داری اور تواضع کی، بادشاہ کو علم ہوا تو وہ نواب سے ناراض ہوا، پھر حکم دیا کہ اس فقیر سے کہو کہ برہانپور سے اُٹھ کر اکبر آباد آ جائے، جس کے حکم کی تعمیل میں آپ اکبر آباد (آگرہ) آ کر مقیم ہو گئے۔(۵۱) اس کے بعد آپ تاحیات یہیں رہے، یہیں وصال ہوا اور دفن کیے گئے، شاہ جہاں کے زمانہ (۱۰۳۷ھ/۱۰۶۸ء) میں آپ کو اکبر آباد کا صدر بنایا گیا۔(۵۲) آپ نے برہانپور سے جاتے ہوئے اپنے خویش (داماد) خواجہ محمد ہاشم کشمی کو اپنا قائم مقام بنایا۔(۵۳)

میر محمد نعمان بدخشی کی اولاد:

میر صاحب حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ''کثرتِ عیال'' کے باعث تنگ دست تھے۔(۵۴) اور شدتِ فقر وغایت فاقہ میں تھے۔(۵۵) ہمیں تا حال کسی معاصر ماخذ سے آپ کی اولاد کی پوری تفصیل نہیں مل سکی، تاہم آپ کے ایک فرزند میر عبد الفتاح نے بتایا ہے کہ ہم چھ بھائی اور تین بہنیں ہیں، مفتاح العارفین کی رو سے آپ کی اولاد کا شجرہ اس طرح مرتب کیا جا سکتا ہے۔

میر ابراہیم بدخشی:

کم سنی سے ہی اورنگ زیب عالمگیر کے زمانہ شہزادگی میں اس کے ساتھ مصاحب کے طور پر رہتے تھے، میر محمد نعمان کے فرزند بزرگ تھے، ان کا عمل عزیمت پر تھا۔ ۱۰۶۷ھ/۱۶۵۷ء کو جب حضرت مجدد الف ثانی کے صاحبزادگان حج کے لیے گئے تو میر ابراہیم بھی ان کے ہمراہ بندرگاہ سورت تک گئے، وہاں پہنچ کر ان پر حرمین شریفین کی محبت کا غلبہ ہوگیا۔ تو بادشاہ اور اپنے خاندان سے اجازت لیے بغیر ہی ان کے ہمراہ روانہ ہو گئے، انھوں نے روضۂ نبوی ﷺ پر تخت نشینی کی جنگ میں اورنگ زیب کے لیے دعائیں کیں، جب واپس آئے تو انہیں معلوم ہوا کہ اورنگ زیب کامیاب ہو کر تخت نشین ہو چکا ہے۔ جب موصوف اُسے مبارک باد دینے کے لیے گئے تو بادشاہ نے کہا کہ میں نے ارادہ کیا تھا کہ جب میں سلطنت حاصل کرلوں گا تو اہلِ حرمین کے لیے نذر و تحائف بھیجوں گا، تم وہاں سے واقف ہو، لہٰذا ہمارے تحائف وسوغات وہاں کے شرفاء اور شاہ یمن امام اسماعیل کے لیے لے کر جاؤ، جب آپ سلطان کی نذور لے کر یمن کے قصبہ ''بربیم'' پہنچے تو وہاں ان کا انتقال ہوگیا، یہ ۲۷ صفر ۱۰۷۰ھ کا واقعہ ہے۔(۵۶) انہیں حضرت خواجہ باقی باللہ کے فرزند خواجہ خرد کے ساتھ بڑا اُنس تھا۔(۵۷)

معاصر مورخ بختاور خان نے نذر کی یہ رقم چھ لاکھ ساٹھ ہزار روپے بتائی ہے جب اورنگ زیب کو ان کے انتقال کی خبر دی گئی اور یہ ۱۰۷۱ھ/۱۶۶۱ء کے واقعات کے تحت درج ہوا ہے(۵۸) گویا ان کے خاندانی ماخذ مفتاح العارفین میں ۱۰۷۰ھ غلط ہے، مآثر عالمگیری میں ہے کہ انہیں ۱۰۷۰ھ کو اس کارِ خیر کے لیے متعین کیا گیا:

> ''میر ابراہیم ولد میر نعمان مغفور برسانیدنِ اجناس شش لک، سی ہزار روپیہ بشرفای مکہ معظّمہ و مدینہ منورہ زادھما اللہ شرفاً معین شد۔''(۵۹)

لیکن اس کے اگلے ہی سال ۱۰۷۱ھ کو اورنگ زیب کو ان کے وہاں فوت ہونے کی اطلاع دی جاتی ہے۔(۶۰) ہمت خان میر بخشی بن میر ضیاء الدین حسین اسلام خان کی دختر ان کے نکاح میں تھی، یعنی میر ضیاء الدین حسین کی پوتی میر محمد نعمان کی بہو تھی۔(۶۱)

میر عبدالرحمٰن:

حضرت مجدد الف ثانی کے مرید تھے۔(۶۲) رویت اُخروی کے سلسلہ میں ان کو کچھ شبہات تھے

حضرت مجدد الف ثانی نے ایک مکتوب ''در رفع شبہات منکران رویت اُخروی'' ان کے نام لکھا ہے، (۶۳) میر عبدالرحمٰن کے بھائی میر عبدالفتاح نے ان کے بارے میں کیا خوب لکھا ہے:

''علامہ و محقق و فہامہ مدقق بودند و تمام عمر در توکل گزراند و مرید شیخ احمد سرہندی اند، صاحبِ حال باعمل بودند و بعد از تحصیل علوم ظاہری بدرس مشغول گشتند و بخدمت طبع درس می فرمودند و در زمان خود پیش رو خلق بودند و خوش گو و خوش خو بودند و معمور الاوقات و دائم العبادات و در طریقۂ پدران خود بی نظیر بودند، با اہلِ دل نزدیک و از اہلِ دول دور بودند در شب براۃ از نماز مغرب رکعت کردہ بودند کہ برحمت حق پیوستند و در سنہ ہزار و ہفتاد و شش و عمر شریف ہشتاد و سہ سال بود، درونِ گنبد والد ماجد خود مدفون گشتند۔'' (۶۴)

گویا ۱۰۷۶ھ/ ۱۶۶۵ء کو فوت ہوئے اپنے والد گرامی میر محمد نعمان بدخشی کے حظیرہ اکبر آباد میں دفن کیے گئے۔

میر محمد اسحٰق:

یہ بھی میر محمد نعمان بدخشی کے فرزند تھے، ابتداء میں بادشاہ کے ہاں ملازمت کرتے تھے، اسی لیے ان کے والد اکثر فرمایا کرتے تھے کہ مجھے معلوم نہیں ہے کہ یہ نادان مجھ سے کیا چاہتا ہے، غرض اسی حال میں کچھ عرصہ گزر گیا تو ان پر اچانک جذبہ طاری ہوا۔ جو آخری عمر تک قائم رہا۔ ان سے بعض کرامات بھی سرزد ہوئیں، ۴ جمادی الاول روز جمعہ ۱۰۸۱ھ/ ۱۶۷۰ کو رحلت ہوئی اور اپنے والد بزرگوار کے احاطۂ مزار میں دفن ہوئے۔ (۶۵)

میر محمد اسحٰق کے یہ حالات ان کے بھائی میر عبدالفتاح نے تحریر کیے ہیں، یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ ابتداء میں کس بادشاہ کے ہاں ملازمت کرتے تھے، عہد جہانگیر کی کتبِ تاریخ میں ان کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔

میر عبداللہ:

حضرت مجدد الف ثانی نے اپنے ایک مکتوب میں انہیں میر محمد نعمان کا فرزند لکھا ہے، اور انہیں اس جوانی کو غنیمت جاننے کی نصیحت کرتے ہوئے تحصیلِ علم اور اس پر عمل کرنے کا حکم دیا ہے اور بتایا کہ ان کے والد چند روز کے بعد ان کے پاس پہنچ جائیں گے۔ (۶۶)

اس کے علاوہ ان کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔

میر محمد امین:

حضرت مجدد الف ثانی نے ایک مکتوب ان کی والدہ کے نام لکھا ہے اور انہیں ذکرِ الٰہی کی ترغیب اور دنیا کی محبت سے بچنے کی تلقین فرمائی ہے۔(۶۷) اسی طرح ایک اور مکتوب میں میر محمد نعمان بدخشی کے ایک فرزند کو اسی قسم کے نصائح کیے ہیں(۶۸) جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کا یہ مکتوب انہی میر محمد امین کے نام ہے جو میر محمد نعمان کے فرزند گرامی تھے۔

میر عبدالفتاح:

میر عبدالفتاح نے خود اپنے والد کا نام محمد نعمان لکھا ہے(۶۹) انہوں نے خواجہ محمد معصوم سرہندی کو ''پیر دستگیر'' بتاتے ہوئے آپ کی ایک مجلس میں خود کو حاضر بتایا ہے۔(۷۰) حضرت خواجہ کا ایک مکتوب بھی میر عبدالفتاح کے نام ہے جو ''ادائے لوازمِ طلب گاری'' کے موضوع پر ہے۔(۷۱)

میر عبدالفتاح، صوفیہ کے ایک اہم تذکرہ مفتاح العارفین کے مؤلف ہیں جس میں عرفا کے سال وفات کے اعتبار سے صوفیہ کے حالات نہایت اختصار سے لکھے گئے ہیں، چونکہ مولف خانوادۂ مجددیہ کے افراد سے قرابت قریبہ رکھتے تھے اس لیے اس تذکرہ میں دوسرے سلاسل کے مقابلہ میں سلسلۂ نقشبندیہ کے بزرگوں کے زیادہ حالات درج ہیں، میر عبدالفتاح نے اس میں اپنے خاندان، بھائیوں اور بہنوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا پورا خانوادہ حضرات مجددیہ کا حلقہ بگوش تھا۔

مفتاح العارفین میں سال تالیف درج نہیں ہے اس کے آخری اوراق میں ۱۰۹۶ھ/ ۱۶۸۴ء تک کے واقعات ملتے ہیں۔(۷۲) اس تذکرہ کا فارسی متن تا حال شائع نہیں ہوا ہے۔ اس کے صرف دو خطی نسخوں کا ہمیں تا حال علم ہے۔(۷۳)

میر محمد نعمان کے ان چھ فرزندوں کے علاوہ تین بیٹیوں کا ذکر بھی ملتا ہے، یعنی:

دختر منسوب خواجہ محمد ہاشم کشمی:

خواجہ محمد ہاشم کشمی، میر محمد نعمان بدخشی کے ہم وطن، مرید اور داماد تھے، ان کی ابتدائی تعلیم سلوک میر محمد نعمان ہی کے ہاں ہوئی تھی، پھر انہی کے حکم پر ۱۰۳۱ھ/۱۶۲۱ء کو حضرت مجدد الف ثانی کی خدمت میں حاضر ہو کر تکمیل کی، اپنے پہلے شیخ میر محمد نعمان کے نام کی نسبت سے وہ اپنے نام کے ساتھ نعمانی لکھتے تھے۔(۷۴)

خواجہ کشمی نے خود لکھا ہے کہ میر محمد نعمان کی صاحبزادی میرے عقد میں ہے، موصوفہ کم سنی سے ہی

حضرت خواجہ باقی باللہ کے حضور لے جائی گئی تھیں اور حضرت کی دعا سے انہیں شفا نصیب ہوئی تھی، یہ دختر عفت مآب مدتوں فیروز آباد دہلی میں حضرت خواجہ سے بیعت ہونے والی خواتین کی تعلیم وتربیت کے لیے مامور رہیں۔(۷۵) اس خاتون کے بھائی اور میر محمد نعمان کے فرزند میر عبدالفتاح نے لکھا ہے کہ خواجہ کشمی میر محمد نعمان کے داماد ہیں۔(۷۶) ڈھاکہ یونیورسٹی کے مخطوط دیوانِ خواجہ محمد ہاشم کے ایک زائد ورق پر خواجہ کشمی کا سال وفات ۱۰۴۳ھ درج ہے جو قرائن کے قریب معلوم ہوتا ہے۔(۷۷) میر محمد نعمان کی اس دختر نیک اختر سے صرف ایک ہی فرزند خواجہ محمد قاسم اور ایک بیٹی صفیہ تولد ہوئی۔(۷۸)

خواجہ کشمی کئی کتابوں کے مولف تھے جن میں زبدۃ المقامات زیادہ مشہور ہے۔ انہوں نے مکتوبات حضرت مجدد الف ثانی کی تیسری جلد بھی مرتب کی تھی۔

دختر منسوب بہ خواجہ محمد مومن جذبی:

خوجہ محمد مومن جذبی بن خواجہ عبدالرافع سمرقندی نقشبندی، موصوف سمرقند میں ۹۹۹ھ/ ۱۵۹۰ء کو تولد ہوئے، ان کا نسب والد کی طرف سے شیخ سیف الدین باخزری اور والدہ کی طرف سے خواجہ نورالدین بصیر سے ملتا ہے، خواجہ جذبی کو شاعری کے فن سے بھی بہرۂ کامل نصیب ہوا تھا، موصوف میر محمد نعمان کے خلیفہ و داماد تھے، ۱۰۵۲ھ/ ۱۶۵۲ء کو وصال ہوا۔(۷۹)

دختر منسوب بہ خواجہ محمد ابراہیم:

سید خواجہ محمد ابراہیم، میر محمد نعمان کے خلیفہ و داماد تھے، انہوں نے ساری زندگی اپنے شیخ کی خدمت و رضا جوئی میں صرف کر دی اور ان کے مزاج میں کمال رسوخ پیدا کر لیا، آخری عمر میں انہوں نے اپنے شیخ سے مکتوبات حضرت مجدد الف ثانی پڑھے، میر محمد نعمان نے انہیں خلافت دے کر رخصت کیا تھا۔ اپنے اکثر مریدین بھی تربیت کے لیے انہیں کے حوالہ کر دیئے تھے، ۲۳ شوال جمعہ کے روز خطبہ کے وقت ۱۰۷۱ھ/ ۱۶۶۱ء کو وصال ہوا۔(۸۰)

مریدین وخلفاء میر محمد نعمان:

میر صاحب نے اپنے ایک عریضہ بنام حضرت مجدد الف ثانی میں اپنے مریدین کی کثرت کا ذکر کیا ہے، جس پر حضرت نے بڑی خوشی کا اظہار فرماتے ہوئے انہیں مریدین کی کثیر تعداد پر فخر کرنے سے منع کیا ہے، میر صاحب کو جب تیسری بار برہان پور بھیجا گیا تو ان کی روحانیت میں بڑی حدت پیدا ہو چکی تھی، ملنے

والے اس کی تاب نہیں لا سکتے تھے وہ تڑپنے لگتے، جہانگیر نے بھی آپ کو کثرت مریدین کے باعث ہی آگرہ طلب کیا تھا۔(۸۱)

آپ کے چھ فرزند تو آپ سے سلوک باطنی کی تعلیم حاصل کرتے ہی رہے تھے آپ کے تینوں داماد بھی آپ کے خلفاء میں شامل تھے۔(۸۲)

ان کے علاوہ مرزا محمد شریف (ف ۲ ربیع الاول ۱۰۶۹ھ/ ۱۶۵۸ء) بن پیر محمد بن شریف الدین حسین بن شاہ کمال الدین حسین خوارزمی، درس و تدریس میں ہمہ وقت مصروف رہتے تھے۔(۸۳) میر محمد اسحٰق ہراتی بھی میر محمد نعمان کے مرید اور خواجہ محمد مومن جذبی (داماد میر صاحب) کے داماد تھے، انہیں خواجہ محمد سعید سرہندی سے خلافت حاصل تھی۔ ۷ محرم ۱۰۸۳ھ/ ۱۶۷۲ء کو شاہ جہان آباد میں وفات ہوئی وہاں سے ان کی نعش لا کر ان کے شیخ کے قریب دفن کی گئی۔(۸۴)

حاجی محمد صالح بھی آپ کے مرید و خلیفہ تھے، وہ کم سنی سے ہی میر صاحب کی خدمت میں رہتے تھے۔ اپنی والدۂ محترمہ کو اپنے کندھوں پر اُٹھا کر حج کروانے کی سعادت نصیب ہوئی تھی، اکبر آباد میں مسجد وقار کے قریب سکونت تھی، کسی امیر کا روزینہ قبول نہیں کیا، ۱۰۸۶ھ/ ۱۶۷۵ء کو رحلت ہوئی۔ اکبر آباد میں ہی دفن ہوئے۔(۸۵)

حاجی عبدالرشید حصولِ علم کے بعد میر صاحب کی خدمت میں آئے اور ان کے حکم نہ فرمانے کے باوجود خواجہ محمد ابراہیم (داماد میر صاحب) کی خدمت میں بیعت کی، صاحبزادگان سرہند کے ہمراہ ۱۰۶۷ گ/ ۱۶۵۶ء کو حج کے لیے گئے وہاں علم قراءت میں مہارت حاصل کی اور واپس اکبر آباد آ کر درس و تدریس میں مصروف ہو گئے وہیں ۱۰۹۲ھ/ ۱۶۸۱ء کو رحلت فرمائی۔(۸۶)

حاجی گدا بھی میر صاحب کے مرید، شہر جہان آباد میں مقیم تھے ان کی عمر سو سال کے قریب تھی، ۶ شوال ۱۰۹۵ھ/ ۱۶۸۴ء کو وفات ہوئی۔(۸۷)

خود میر صاحب نے اپنے مکتوب بنام حضرت مجدد الف ثانی میں اپنے مریدین خواجہ رحمی، سید احمد اور میر عبداللطیف کا ذکر کیا ہے، اس مکتوب سے معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب کو سلسلہ قادریہ میں بھی اجازت حاصل تھی۔(۸۸)

میر ضیاء الدین حسین بدخشی مخاطب بہ اسلام خان:

اورنگ زیب عالمگیر کے قدیم ساتھیوں میں سے تھا، شیخ سلیم چشتی کی اولاد میں سے تھا اور ساری عمر اُسی

کے ساتھ صرف کر دی، میر محمد نعمان بدخشی سے خاص عقیدت تھی، ۱۰۷۴ھ کوفوت ہو کر انہی کے احاطۂ مزار میں دفن ہوا۔ (۸۹) اس نے میر صاحب کے مزار کے قریب ایک بڑی مسجد بھی تعمیر کروائی تھی۔ (۹۰) اسلام خان فارسی میں شعر کہتا تھا اور اس کا تخلص والا تھا۔ (۹۱)

سالِ وفات:

میر محمد نعمان کے سالِ وصال میں اختلاف ہے، دونوں معاصر تذکرے'' زبدۃ المقامات'' اور'' حضرات القدس'' میر صاحب کے حینِ حیات مکمل ہو چکے تھے۔ مولف'' حضرات القدس'' نے ان کے نام کے ساتھ'' قدس سرہٗ'' لکھا ہے۔ (۹۲) جو مرحومین کے لیے لکھا جاتا ہے، لیکن اس میں سال وفات موجود ہی نہیں ہے، اس کے بعد میر صاحب کے فرزند میر عبدالفتاح کا تذکرہ مفتاح العارفین (تالیف حدود ۱۰۹۶ء) ہی ایک ایسا ماخذ ہے جس میں ۱۷ صفر ۱۰۵۹ھ/ ۱۶۴۹ء درج ہے۔ (۹۳) جو ہمارے نزدیک معتبر ترین ہے، ان کے ایک اور ہم وطن تذکرہ نویس مرزا محمد بن رستم حارثی بدخشی نے بھی یہی سنہ لکھا ہے، لیکن تاریخِ وفات ۱۸ صفر دی ہے۔ (۹۴) میر صاحب کے مزار پر جو کتبہ نصب ہے (۹۵) اس پر ۱۸ صفر ۱۰۵۸ھ اور مادۂ تاریخ:

'' ہادئ زمان مخدوم میر'' ۱۰۵۸ء لکھا ہوا ہے، اگر اس مادہ میں ہادئ زمان کے ہمزہ کا ایک عدد شمار کر لیا جائے تو یہ صحیح طور پر ۱۰۵۹ھ بن جائے گا، جو درست ہے۔ لگتا ہے کہ کتبہ نصب کرنے والے کو یہ بات معلوم نہیں تھی۔ میر عبدالفتاح نے لکھا ہے کہ ہمارے والد کو ان کی تعمیر کردہ مسجد کے صحن میں دفن کیا گیا، میر ضیاء الدین مخاطب بہ اسلام خان نے میر صاحب کا مزار تعمیر کروایا (۹۶) اور اس کے قریب ایک مسجد بھی بنوائی تھی۔ (۹۷) مرزا حارثی نے یہ بھی لکھا ہے کہ بعض حضرات ان کا سالِ وفات ۱۰۶۱ھ بھی بتاتے ہیں (۹۸) جو درست معلوم نہیں ہوتا۔ میر صاحب کے ایک اور معاصر شیخ کمال محمد سنبھلی مرید خواجہ خرد بن خواجہ باقی باللہ بھی تھے انہیں میر صاحب کا سال وصال حتمی طور پر معلوم نہیں تھا انہوں نے'' ہزار و پنجاہ و انده است'' لکھا ہے۔ (۹۹)

تصانیف:

میر محمد نعمان نے جس زمانہ (۹۷۷۔۱۰۵۹ھ/ ۱۵۶۹۔۱۶۴۹ء) میں پرورش پائی وہ علمی، دینی اور ادبی اعتبار سے مسلمانوں کا زریں دور تھا، سمرقند جہاں آپ کی ولادت ہوئی وہ اس دور میں دینی و علمی مرکز تھا، ہر طرف علماء، مشائخ اور شعراء مصروف کار تھے، حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ کی طرح آپ بھی تلاش شیخ

میں خوب گھومے پھرے اہلِ علم وعرفان سے صحبت رہی، جن میں اکابر اہلِ علم ودانش شامل تھے، حضرت خواجہ خود شاعر اور مصنف تھے، صوفیہ میں اعلیٰ درجہ کا ادبی ذوق تھا۔ حضرت مجدد الف ثانی تصنیف وتالیف اور شعرو ادب کا گہرا ذوق رکھتے تھے، حضرت کے وصال پر بہت سے اصحاب نے قطعات تاریخ لکھے جن میں خواجہ محمد ہاشم کشمی نے ۶۳ مادہ ہائے تاریخ اور میر محمد نعمان نے ۶۲ مادہ ہائے تاریخ وصال کہے تھے جو حضرات القدس میں منقول ہیں۔ (۱۰۰) حضرات القدس جیسی مثالی سوانح مولف نے میر محمد نعمان ہی کے امر پر تالیف کی تھی۔ (۱۰۱)

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان مرحوم نے میر محمد نعمان کا مؤلفہ ایک مختصر ''رسالہ سلوک'' حافظ مولانا محمد ہاشم جان مجددی کے کتب خانہ سے حاصل کر کے شائع کیا تھا۔ (۱۰۲) بظاہر اس رسالہ کا ذکر کسی تذکرہ نویس نے نہیں کیا، یہاں تک کہ آپ کے فرزند گرامی میر عبدالفتاح بھی اس سے ناواقف تھے، میر صاحب نے اس عہد کے طریقہ تالیف کے مطابق اس کے آغاز میں اپنا نام بھی بحیثیت مؤلف نہیں لکھا، جب تک کوئی معاصر ثبوت نہ مل جائے اس کا میر محمد نعمان سے انتساب مشکوک رہے گا۔

مکتوباتِ حضرت مجدد الف ثانی بنام میر محمد نعمان:

حضرت کے سب سے زیادہ مکاتیب آپ ہی کے نام ہیں، یعنی:

۱/۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۷۳، ۲۰۴، ۲۰۹، ۲۲۴، ۲۳۱، ۲۳۸، ۲۴۶، ۲۵۷، ۲۶۱، ۲۸۱، ۳۱۲، ۲/۴، ۲۹، ۹۹، ۳/۱، ۴، ۵، ۹، ۱۰، ۱۲، ۱۵، ۱۸، ۱۹، ۲۱، ۲۶، ۳۰، ۳۶، ۴۹، ۱۰۲

آپ کو مکتوبات حضرت مجدد الف ثانی سے خصوصی دلچسپی تھی، پہلی دو جلدوں کی تکمیل کے بعد انہیں خیال آیا کہ ان کے بعد لکھے جانے والے مکاتیب شریفہ بھی جمع کروانے چاہیں چنانچہ میر محمد نعمان نے اپنے مرید وداماد خواجہ محمد ہاشم کشمی کو اس کا امر فرمایا، خواجہ کشمی خود لکھتے ہیں:

> ''۔۔۔ معدن الایقان والعرفان۔۔۔ التماس نمودند کہ آں لآلی منثورہ را فراہم آوردہ دفینۂ جلد ثالث بروی کار آید، ما اجابت مقرون گشت۔۔۔ این کمترین بجمع مسودات ونقل آں از سواد بہ بیاض ممتاز گردید با تمام جلد ثالث در ہماں سال کہ از لفظ ''ثالث'' (۱۰۳) نیز معین است سرفراز شد۔'' (۱۰۴)

سلاطین وامراء سے تعلقات:

جیسا کہ ہم وضاحت کر چکے ہیں کہ میر محمد نعمان ہندوستان تشریف لائے تو متعلقین کی کثرت کے

باعث تنگ دستی رہنے لگی، آپ نے بادشاہ کے ہاں نوکری کر لی، یہاں کون بادشاہ مراد ہے، ظاہر ہے یہ ملازمت آپ نے حضرت خواجہ باقی باللہ۔۔۔ کے حین حیات (۱۰۱۲ھ) کی، یہ ملازمت کس درجہ کی تھی، محض دعا گو کے طور پر ایسے اصحاب کو کچھ وظیفہ دے دیا جاتا تھا یا آپ نے حضرت خواجہ کے دو مخلص امیروں عبدالرحیم خان خانان اور میر مرتضیٰ خان فرید بخاری کی مصاحبت اختیار کی ہو گی۔ کتب تاریخ میں ان امور کی تفصیلات نہیں ملتیں لیکن جب امیر منصب دار نے حضرت خواجہ کے کثیر اہل وعیال کے ساتھ تنگ دستی کے باعث پریشان ہیں،جس پر حضرت خواجہ نے انہیں اس ''چرک'' سے آزاد رکھنے کی ہدایت فرمائی۔ (۱۰۵)

میر صاحب کے سب سے زیادہ تعلقات عبدالرحیم خان خانان کے ساتھ تھے جس زمانہ میں انہیں خلافت دے کر برہانپور بھیجا گیا خانِ خانان اس دور میں دکن کا گورنر تھا۔حضرت مجدد الف ثانی نے اپنے ایک مکتوب بنام خانِ خانان میں میر صاحب کے متعلق لکھا ہے:

> ''ان حدود (برہانپور) میں سیادت پناہ حقائق ومعارف آگاہ میر محمد نعمان کا وجود غنیمت ہے۔ میں ان کی دعا اور توجہ کو کبریت احمر سمجھتا ہوں کہ ان کی توجہات کی برکات وفیوض سے آپ کا وجود (منصب) قائم ہے اور میں ان کی توجہات کو آپ کے لیے غیر حاضری میں بھی ممد و معاون تصور کرتا ہوں۔ایک سال سے زیادہ ہوا کہ میر صاحب نے آپ کی خوبیاں غائبانہ طور پر مجھے لکھیں اور مجھ فقیر کے ساتھ آپ کو جو محبت ہے اس کا اظہار بھی کیا اور یہ بھی لکھا کہ اس علاقہ کی صوبہ داری کسی اور کو تفویض کیے جانے کی منصوبہ بندی کی جارہی ہے یہ وقت توجہ اور دستگیری کا ہے میں نے خط کے مطالعہ کے دوران توجہ کی تو آپ کو عالی قدر حالت میں دیکھا۔''(۱۰۶)

جامع مسجد برہانپور کی مرمت وتوسیع:

دکن پر فاروقی سلاطین کے آخری دور میں عادل شاہ چہارم (راجہ علی ۹۸۵۔۱۰۰۵ھ/ ۱۵۷۷۔ ۱۵۹۷ء) نے ایک وسیع مسجد کی تعمیر کا آغاز کیا،جس پر ۱۵۸۸ء تک کام ہوتا رہا۔ (۱۰۷) پھر وہ آگے نہ بڑھ سکا،صرف منصوبہ کی حد تک اس کی تعمیر ہو سکی،اس کی تکمیل جہانگیر کے عہد میں ہوئی۔ (۱۰۸)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۰۱۸ھ/ ۱۶۰۹ء کو جب میر محمد نعمان کو حضرت مجدد الف ثانی نے خلافت دے کر برہانپور میں متعین کیا تو وہ شہر کی اسی مسجد میں آکر ٹھہرے اور دعوت وارشاد کا آغاز کیا،میر صاحب کے زمانہ میں یہ مسجد شکست وریخت کا شکار ہو چکی تھی،مرزا عبدالرحیم خانِ خانان کو دکن کے معاملات کے لیے بھیجا گیا

کیوں کہ مغلوں کو وہاں کے حاکموں کے ہاتھوں شکست کا سامنا تھا، خانِ خانان ۱۰۱۶ھ/ ۱۶۰۸ء کو برہانپور پہنچا، کئی مہمات میں کامیابی ہوئی لیکن اس کے دشمن مسلسل جہانگیر کے کان بھرتے رہے، یہاں تک کہ اُسے واپس بلا لیا گیا، تحقیق احوال کے لیے امراء کو متعین کیا گیا، اسے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ اس میں خانِ خانان کا قصور نہیں تھا اُسے ۱۰۲۱ھ/ ۱۶۱۲ء کو مزید ترقی دے کر دکن کی فتح کی تکمیل کے لیے روانہ کیا گیا۔ (۱۰۹) حضرت مجدد الف ثانی کے منقولہ بالا مکتوب (۲/ ۶۲) میں اس کی صوبہ داری دکن سے معزولی اور پھر مکاشفہ میں اُس کا دوبارہ زیادہ شان کے ساتھ ظاہر ہونے کا اسی طرف اشارہ ہے گویا حضرت کا یہ مکتوب مذکورہ سنہ میں تحریر کیا گیا ہے۔

خانِ خانان میر محمد نعمان کا بہت احترام کرتا تھا اُسے ان پر کامل اعتماد تھا، آپ نے خان سے کہا کہ برہانپور کی اس عظیم مسجد کی مرمت اور تکمیل کرنی چاہیے، معاصر مورخ عبدالباقی نہاوندی کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

> ''مسجد جامع ایں شہر (برہانپور) عمارتی است عالی و بنائی متعالی واز آثار عجیبۂ غریبہ کہ دریں ولایت ہست، بہتر از عالی بنا چیزی نیست، وصفۂ وسیع منیع کہ با عرصہ سماوات دم مساوات بزند، در پیش طاق آں ساختہ بودند، و بمرور ایام بسان بنای عمر ظلمہ منہدم و ویران شدہ بود بساختن وتعمیر امر فرمودند، و بنوعی با تمام رسید کہ زبان قلم مسکور للسان از تعریف و توصیف آں عاجز ست، و گویا روزگار بواسطۂ اینش خراب ساختہ بود کہ بہتر از اول تمام شود، واکثر شکست و ریخت ایں مسجد بسعیٔ سیادت پناہ قدوۃ السالکین امیر نعمان بدخشی کہ از جملہ درویشان صاحبِ سلوک حال است، واز یں مسجد می باشد و برخوان احسان ایں سپہ سالار با جمعی کثیر موظف انداز عین المال سپہ سالار تعمیر شد، وہمہ روزہ جمعی از صلحاء وعباد وزہاد در آں جا بعبادت مشغولی می جویند و دعای دولتش می گویند۔''(۱۱۰)

اس طویل اقتباس سے مندرجہ ذیل نتائج اخذ ہوتے ہیں:

۱۔ یہ مسجد برہانپور کے آثار عجیبہ میں سے ہے۔
۲۔ اس میں ایک وسیع وعریض صفہ تعمیر کیا گیا۔
۳۔ مرور ایام سے اس کے بہت سے حصوں کو نقصان پہنچا تھا۔
۴۔ خانِ خانان نے اس کی تعمیر نو کا حکم دیا۔

۵۔ جب وہ تیار ہوگئی تو زیب وزینت میں اس کی مثال نہیں ہے۔

۶۔ اس مسجد کے خراب حصوں (شکست وریخت) کی مرمت سیادت پناہ قدوۃ السالکین امیر نعمان بدخشی نے خود کروائی تھی۔

۷۔ موصوف اسی مسجد میں مقیم تھے۔

۸۔ اس کی تعمیر خانِ خانان کے مال سے کی گئی۔

۹۔ اس وقت سے بہت سے صلحاء، عباد اور زہاد وہاں عبادت میں مشغول اور خان کے لیے دعا گو ہیں۔

یہ عالی شان مسجد جو اب بھی موجود ہے اور برطانوی دور کے ماہرینِ آثارِ قدیمہ کی توجہ کا مرکز رہی ہے اس کے محرابی کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ۹۹۷ھ/ ۱۵۸۸ء کو تعمیر ہوئی پھر ۱۹۶۱ء کو اس کے کتبات کے عکس بھی شائع کیے گئے۔(۱۱۱) کتبہ شناسی کی اس رپورٹ میں ایسا کوئی کتبہ موجود نہیں ہے جو عبدالرحیم خانِ خانان کے دورِ نظامت کا ہوا اور اس میں میر محمد نعمان بدخشی کی مرمت وتوسیع کا ذکر کیا گیا ہو۔ یہاں اس کے کتبات کا عکس اسی ادارہ کی شائع کردہ سمری سے ماخوذ ہے۔

OOO

مآخذ

مخطوطات:

۱۔ عبدالفتاح بن محمد نعمان بدخشی: مفتاح العارفین (تذکرۂ علماء صوفیہ بلحاظ سنین) ذخیرۂ شیرانی،مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری،لاہورنمبر

۲۔ محمد ہاشم کشمی: رسائل خواجہ کشمی، مملوکہ شیخ ابوالخیرعبداللہ جان، پشاور

۳۔ بدرالدین سرہندی،شیخ: حضرات القدس،جلداول،کتاب خانہ لاہورمیوزیم،لاہور

۴۔ ایضاً: سنوات الاتقیاء،ذخیرۂ مولانا غلام محی الدین قصوری،قصور

۵۔ کمال محمد سنبھلی: اسراریہ (تذکرہ علماء وصوفیۂ برصغیر)،کتب خانہ ندوۃ العلماء لکھنؤ

مطبوعات:

۶۔ باقی باللہ،خواجہ: کلیات،مرتبہ ابوالحسن زیدفاروقی وبرہان احمد فاروقی،لاہور:۱۹۶۷ء

۷۔ صفر احمد معصومی: مقامات معصومی مرتبہ محمد اقبال مجددی،لاہور: ۲۰۰۴ء

۸۔ خواجہ کلاں،عبیداللہ: زادالمعاد (تذکرۂ خواجہ حسام الدین احمد) مرتبہ محمد اقبال مجددی،گوجرانوالہ: ۲۰۱۳ء

۹۔ محمد ہاشم کشمی: زبدۃ المقامات،کانپور: ۱۳۰۰ھ

۱۰۔ محمد صادق ہمدانی کشمیری: طبقات شاہ جہانی،مرتبہ محمد اسلم خان،دہلی: (طبقہ نہم دہم)

۱۱۔ محمد ہاشم کشمی: نسمات القدس،اردوترجمہ ازمحبوب واسطی،سیالکوٹ: ۱۴۱۰ھ

۱۲۔ مجددالف ثانی،احمد سرہندی: مکتوبات مرتبہ نوراحمد امرتسری،استنبول،

۱۳۔ عطاء الرحمٰن ابوالعلائی: کیفیت العارفین،آگرہ

۱۴۔ اختر محمد خان: جواہر ہاشمیہ (تذکرہ خواجہ محمد ہاشم کشمی)

۱۵۔ حارثی،محمد بن رستم: تاریخ محمدی مرتبہ نثاراحمد فاروقی،رام پور

۱۶۔ راشدی،حسام الدین: تکملہ تذکرہ شعرای کشمیراز اصلح،لاہور

۱۷۔ محمد اسلم پسروری: فرحت الناظرین ترجمہ وحواشی ازایوب قادری،کراچی

۱۸۔ مستعدخان،محمد ساقی: مآثر عالمگیری،کلکتہ

۱۹۔ بختاورخان: مراۃ العالم (تاریخ عہداورنگ زیب عالمگیر) مرتبہ ساجدہ علوی،لاہور: ۱۹۷۹ء

۲۰۔ محمد اعظم دیدہ مری: تاریخ کشمیر، مرتبہ مفتی محمد سعادت، سری نگر: ۱۳۵۵ھ

۲۱۔ ایضاً: واقعات کشمیر ترجمہ وحواشی از شمس الدین احمد، سری نگر

۲۲۔ عبداللہ بدخشی: ارمغان بدخشان، مرتبہ فرید بیژن، تہران: ۱۳۸۵ھ ش

23. Athar Ali: Apparatus of Empire, Delhi, 1985

24. Rizvi, S.A.A: History of Sufism, Delhi, 1986

25. Brown, P:Indian Architecture(Islamic period)

26. Haig, W: Camberidge history of India,(Vol.4)

27. Naick C.R Abdul Rahim Khan-i- Khanan and his literary circle

28. Rahim, S.A: Inscription of Farooqi Kings from Burhanpur, Epigraphia Indian arabic and Persian supl. 1961,ed.Z.A.Dezai, Delhi, 1962

حواشی

۱۔ عبدالفتاح: مفتاح العارفین، خطی نسخہ ذخیرۂ شیرانی، دانش گاہ پنجاب، لاہور ورق:

۲۔ ان کا لقب بلبل شاہ اس لیے پڑا جب آپ قرآن مجید کی تلاوت کرتے تو بلبلیں جمع ہو کر سنتیں اور کئی ایک اس پرسوز لہجہ کے باعث مر جاتیں۔ حضرت سید شرف الدین بلبل شاہ ہندو راجہ کشمیر رنچن (رنچو) کے زمانۂ حکومت (۱۳۲۰ء سے ۱۳۲۳ء) کشمیر آئے۔ یہ راجہ ان ہی کے ہاتھوں مسلمان ہوا اور سید بلبل شاہ نے کشمیر میں اسلام کی تبلیغ کا آغاز کیا۔ بہت جلد راجہ کے زیر حکمران طبقہ اور عوام نے اسلام قبول کرلیا۔ راجہ ہی نے آپ کے لیے کشمیر میں خانقاہ تعمیر کروائی۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: محمد اعظم، دیدہ مری: تاریخ کشمیر، واقعات کشمیر ترجمہ وحواشی تاریخ کشمیر از شمس الدین احمد، سری نگر، ۲۰۱۱ء، ص ۶۵۳، ۹۶۳

۳۔ (حاشیہ مدحاضر) عبدالفتاح: مفتاح

۴۔ ایضاً، ۲۴۴ب

۵۔ زبدۃ المقامات ۳۲۷

۶۔ حضرات القدس ۲/۲۹۹

۷۔ عبدالفتاح: مفتاح ۲۴۴۔ا

۸۔ زبدۃ المقامات ۳۲۷

۹۔ حضرات القدس ۲/۲۹۹

۱۰۔ کشم: بدخشان کے شہروں میں سے کشم ایک خوبصورت مرکزی علاقہ ہے (ارمغانِ بدخشاں تالیف شاہ عبداللہ بدخشی ۲۲۱ حاشیۂ مرتب) بدخشان کا بڑا حصہ اس وقت افغانستان میں ہے، اس کے سرحدی حصے روس اور پاکستان کے کنٹرول میں ہیں۔

۱۱۔ زبدۃ المقامات ۳۲۷، حضرات القدس ۲/۲۹۹

۱۲۔ مفتاح العارفین ۲۲۷ب

۱۳۔ ایضاً، ۲۲۷ب

۱۴۔ ایضاً

۱۵۔ سنوات الاتقیاء کا خطی نسخہ انڈیا آفس لائبریری، لندن میں ہے۔

۱۶۔ مفتاح، ۲۲۷ب

۱۷۔ شیخ قاسم کرمینی، ۱۵۰۷۔۱۵۷۸ء، کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو:
محمد ہاشم کشمی: نسمات القدس ۲۰۸۔۲۱۶ (اردو ترجمہ)، کشمی: رسالہ در حالات شیخ قاسم، قلمی)، زندہ علی، مفتی: ثمرات المشائخ، خطی نسخہ مخزونہ البیرونی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، تاشکند نمبر ۱۳۳۶ء

۱۸۔ زبدۃ المقامات ۳۲۷، حضرات القدس ۲/۲۹۹، مفتاح، ۲۴۴۔ا

۱۹۔ ایضاً

۲۰۔ ایضاً

۲۱۔ ایضاً

۲۲۔ بدایوانی، عبدالقادر: منتخب التواریخ ۲/۲۴۴ (مطبوعہ تہران)

۲۳۔ زبدۃ المقامات ۲۲۷۔۲۲۸، حضرات القدس ۲/۳۰۰، مفتاح ۲۲۸۔ا

۲۴۔ ایضاً (خواجہ محمد ہاشم کشمی کو سہو ہوا ہے کہ میر بزرگ بلادِ کشم میں دفن ہوئے، زبدۃ ۲۲۷، ہم نے خاندانی روایت کو ترجیح دی ہے)

۲۵۔ مفتاح ۲۴۴۔ا

۲۶۔ بدرالدین سرہندی: حضرات القدس ۲/۲۹۹، زبدۃ المقامات ۲۲۸، مفتاح ۲۴۴ب

۲۷۔ مفتاح، ۲۴۴ب

۲۸۔ اسراریہ ۶۷،زادالمعاد ۴/ ۲۱۰

۲۹۔ زبدۃ،۲۲۸

۳۰۔ حضرات ۲/ ۳۰۰،مفتاح، ۲۴۴ب

۳۱۔ ایضاً

۳۲۔ کلیاتِ خواجہ باقی باللہ،۲۰۔۲۱(زادالمعاد ۱/ ۸۶)

۳۳۔ زبدۃ،۳۲۸،امیر عبداللہ بلخی سے سلسلہ کی نعمت حاصل ہوئی تھی۔(مفتاح، ۲۴۴ب)

۳۴۔ مقاماتِ معصومی ۴/ ۴۸۔۵۰،زادالمعاد،۱/ ۲۴۸،زبدۃ المقامات میں ہے کہ امیر بلخی کے روحانی اشارہ پر میر محمد نعمان ہندوستان آئے،شیخ جنید :شیخ، ۳۰۰،۷: ۱۰: خ:۶۰۰، ج:۳،ن:۵۰، ۱۰۔۷۔۴=۹۷۷ھ

۳۵۔ ایضاً

۳۶۔ مفتاح، ۲۴۴ب

۳۷۔ حضرات ۲/ ۳۰۱

۳۸۔ ڈاکٹر اطہر علی نے منصب داروں کی جو فہرستیں مرتب کی ہیں ان میں میر محمد نعمان بدخشی نام کی کسی شخصیت کا ذکر نہیں ہے، دیکھئے:Apparatus of Empire

۳۹۔ مفتاح، ۲۴۴ب

۴۰۔ ایضاً

۴۱۔ زبدۃ المقامات،۳۳۰

۴۲۔ ایضاً،حضرات القدس ۲/ ۳۰۲

۴۳۔ ایضاً

۴۴۔ حضرات القدس ۲/ ۳۰۲،زبدۃ المقامات ۳۳۱

۴۵۔ ایضاً

۴۶۔ ایضاً

۴۷۔ حضرات القدس ۲/ ۳۰۲

۴۸۔ مکتوبات ۱/ ۲۴۶،حضرات القدس ۲/ ۳۰۲

۴۹۔ مکتوبات ۱/ ۲۳۸

۵۰۔ حضرات القدس ۲/ ۳۰۵

۵۱۔ ایضاً

۵۲۔ مقالہ حاضر تحت عنوان ملازمت

۵۳۔ طبقات شاہ جہانی ۱۰/۲۸، یہاں ڈاکٹر اطہر عباس رضوی کو غلط فہمی ہوئی ہے انہوں نے لکھا ہے کہ یہ معلوم نہیں ہے کہ برہانپور میں خواجہ محمد ہاشم نے میر محمد نعمان کے ساتھ روحانی تعاون کیا یا میر صاحب واپس سرہند چلے گئے، (History of Sufism Vol:2, P226) حالانکہ طبقات کی واضح معاصر شہادت موجود ہے کہ میر صاحب انہیں اپنا قائم مقام بنا کر اکبر آباد گئے۔

۵۴۔ زبدۃ المقامات ۳۲۸

۵۵۔ حضرات القدس ۲/۳۰۱

۵۶۔ مفتاح العارفین ۱۵۲۔ا

۵۷۔ اسراریہ ۱۷۳

۵۸۔ مرآۃ العالم ۱/۲۲۸۔

۵۹۔ مستعد خان، محمد ساقی: مآثر عالمگیری ۲۸

۶۰۔ مرآۃ العالم ۱/۲۲۸

۶۱۔ مآثر الامراء م ۱/۱۱۹

۶۲۔ مفتاح العارفین ۲۵۴ب

۶۳۔ مکتوبات ۳/۴۴

۶۴۔ مفتاح العارفین، ۲۵۶ب

۶۵۔ مفتاح العارفین ۲۵۶،ا

۶۶۔ مکتوبات ۱/۱۷۹

۶۷۔ مکتوبات ۳/۳۴

۶۸۔ ایضاً، ۱/۱۹۰

۶۹۔ مفتاح العارفین (آغاز)

۷۰۔ ایضاً ۲۵۴ب، ۲۵۶۔ا

۷۱۔ مکتوبات معصومیہ ۳/۲۵/۵۴۔۵۵

۷۲۔ مفتاح العارفین

۷۳۔ ایک نسخہ ذخیرۂ شیرانی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، دوسرا دارالعلوم دیوبند میں ہے۔

۷۴۔ زبدۃ المقامات ۱۳۰ افغانی متن میں سہو کتابت ہے

۷۵۔ ایضاً ۱۹

۷۶۔ مفتاح ۲۳۸۔ا

۷۷۔ نقد عمر ۵۳

۷۸۔ جواہر ہاشمیہ ۴۴۔۴۵ (تعجب ہے کہ مولوی اختر محمد خان رام پوری نے بغیر کسی حوالہ کے خواجہ کشمی کی شادی دہلی کے معزز خاندان میں ہونے کا ذکر کس طرح کر دیا، جبکہ آپ خود ہی میر محمد نعمان، داماد بتا رہے ہیں (زبدۃ ۱۹) خواجہ کشمی کے چار عریضے میر محمد نعمان کے نام ان کے مجموعہ مکاتیب میں موجود ہیں ورق ۵۲۔۵۹

۷۹۔ مفتاح العارفین ۲۴۲۔ا، ب (میر الفتاح نے ان کی ایک نعتیہ رباعی بھی نقل کی ہے)

۸۰۔ ایضاً، ۲۵۲۔ا، ب

۸۱۔ تفصیل بیان کی جا چکی ہے

۸۲۔ آپ کے فرزند میر عبد الفتاح نے ان تینوں کا ذکر کرتے ہوئے انہیں خلیفہ و داماد لکھا ہے۔

۸۳۔ مفتاح العارفین ۲۵۱۔ا

۸۴۔ ایضاً، ۲۵۔ا

۸۵۔ ایضاً، ۲۵۸۔ا

۸۶۔ مفتاح ۲۵۹۔ا

۸۷۔ ایضاً، ۲۰۹۔ب

۸۸۔ مکتوبات ۱/ ۲۳۸

۸۹۔ مرآۃ العالم ۲/ ۶۸۰

۹۰۔ مآثر الامراء ۱/ ۲۱۶/ ۲۱۸

۹۱۔ مختلف تذکروں کے اقتباسات کے لیے دیکھئے تذکرہ شعرای کشمیر ۴/ ۱۶۶۵۔۱۶۷۰

۹۲۔ حضرات القدس ۲/ ۲۹۹

۹۳۔ مفتاح العارفین ۲۴۶ب

۹۴۔ تاریخ محمدی ۲/ ۵/ ۲۸۲

۹۵۔ دیکھئے عکس کتبہ

۹۶۔ مرقعٔ اکبر آباد بحوالہ حاشیۂ محمد ایوب قادری بر فرحت الناظرین ۱۹۶

۹۷۔ مآثر الامراء ۱/ ۲۱۸

۹۸۔ تاریخ محمدی ۲/ ۵/ ۲۸۲

۹۹۔ اسراریہ (تالیف حدود ۱۰۷۴ھ) ص، ۲، ۱۷۱، اندر عدد مجہول از سہ تانہ (فرہنگ عمید)

۱۰۰۔ حضرات القدس ۲/ ۲۱۷

۱۰۱۔ ایضاً ۲/ ۳۱۱

۱۰۲۔ رسالۂ سلوک مع (رسالہ) مشائخ طرق اربعہ منسوب خواجہ باقی باللہ، حیدر آباد، سندھ، ۱۹۶۹ء

۱۰۳، یعنی ''ثالث'' ۱۰۳۱ھ

۱۰۴۔ رسالہ روداد تدوین مکتوبات ۳۴ب، مشمولہ رسائل کشمی قلمی۔

۱۰۵۔ تفصیل بیان کی جا چکی ہے

۱۰۶۔ مکتوبات ۲/ ۶۲

107. Brown, p: Indian architecture(Islamic period)

108. Haig, c.w ed P-79Cambridge History of India 4/575

۱۰۹۔ خانِ خانان کے دکن کے معمولات کی اصلاح کے اقدامات کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:

Naik, C.R: Abdu'r Rahim Khan-i-Khanan and his Literary circle, pp.160–168

توزک جہانگیری مرتبہ سرسید احمد خان، ص ۱۰۷، وبہ بعد

۱۱۰۔ مآثر رحیمی ۲/ ۶۰۳

111. Rahim, S.A: Inscriptions of farooqi kings from Burhan. Epigraphic Indian Arabic and Persian supl. 1961,ed.Z.A.Desai Delhi, 1962.pp. 53–54

○○○

عصر حاضر کا ایک عظیم صوفی خواجہ فقیر محمد الباروی قدس سرہٗ

محمد رمضان نجم باروی ☆

Abstract:

Time to time some persons came between misties group whom presented the misticism in its original and real form showed its real shape and leaned it depeartmental from every kind of negative temprament.

One of those the personalities of modern age is Khawaja Faqeer Muhammad Barvi the late. He owned of healthy santness who made conspicuous of misticism by his practically life. He had devoted his life always for religion scholors and students, he devoted his life for the serve of religious I mean for Quran and Sunna. The sun of last year 2014, set by the death of this great sainat but his bounty's sun will be always the midday.

Key Words:

Time, Persons, Misties, Misticism, Original, Shape, Temprament, Personalities, Santness, Conspicuous, Bounty.

مخلوق میں سب سے عظیم و رفیع منصب نبوت و رسالت کا ہے جس میں کسب و اخذ کا کوئی دخل نہیں، یہ صرف انتخاب خداوندی ہے جس کا اظہار عالم ارواح میں ''اخذ میثاق''(۱) کی صورت میں ہوا۔ نبوت کے بعد جو سب سے افضل و اکرم درجہ ہے وہ ولایت کا ہے، جسے فقر، سلوک، تصوف، طریقت، معرفت، صالحیت،

☆ پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ علوم اسلامیہ و عربی، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

محبوبیت، احسان اور جذب وخودفراموشی جیسے الفاظ منفردہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

نبوت کو ولایت لازم ہے لیکن ولایت کو نبوت لازم نہیں، یعنی جو انسانِ کامل رسالت ونبوت سے متصف کیا گیا ہے، وہ دو بنیادی حیثیتوں کا حامل ضرور ہوتا ہے۔تعلق باللہ اور تعلق بالخلق ،تعلق باللہ کی جہت ولایت سے اور اس کے ساتھ تعلق بالخلق بھی ہو تو اسے نبوت ورسالت سے بیان کیا جاتا ہے۔(۲)

انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے علاوہ سب افرادِ اُمت ہیں۔افرادِ اُمت بھی تعلق باللہ اور تعلق بالخلق دونوں کے لیے مامور ہیں لیکن وہ نبی نہیں کہلاتے ، کیوں کہ یہ واسطہ نبوت ورسالت کے محتاج ہوتے ہیں جب کہ نبی اپنے رب سے حصول فیض اور قبول احکام میں کسی کا محتاج نہیں ہوتا۔اُمتی بلاواسطہ نبی، اللہ تعالیٰ سے احکام وصول نہیں کرسکتا اور نہ ہی ان کی تفصیل وتوضیح سے آگاہ ہوتا ہے یعنی تعلق باللہ میں غیر نبی، نبی کے واسطے کا محتاج ہے جب کہ نبی اس کا محتاج نہیں۔

مقامِ ولایت کو حاصل کرنے کے دو ذریعے ہیں جن کا اظہار کئی انواع سے ہوسکتا ہے۔محض فضل خداوندی، جس کو مقامِ نبوت ورسالت سے بہت مناسبت ہے کہ نبوت کو بھی کسب وریاضت سے نہیں حاصل کیا جاسکتا بلکہ یہ بھی محض فضل وعنایت اور انتخاب الٰہی ہوتا ہے۔ دوسرا ذریعہ ولایت،کسب مع الفضل ہے۔اس کے لیے شرعی احکام پر جناب رسالت مآب ﷺ کے ارشادات وسنن کی روشنی میں استقامت وہمیشگی کے ساتھ عمل کرنا ضروری ہوتا ہے اور شرعی احکام پہ عمل کے لیے اُن کا جاننا اور علم حاصل کرنا ضروری ہے۔ بلاعلم، عمل کے جادۂ مستقیم پہ قدم اوّلین رکھنا ہی ممکن نہیں تو جتنا عمل زیادہ ہوگا اسی قدر علم درکار ہوگا، ورنہ بلا علم عمل کبھی بلکہ اکثر اوقات ہدایت ورُشد کے بجائے ضلالت وطغیان کا باعث بن جاتا ہے اور اس کی ہزاروں مثالیں ہوسکتی ہیں۔علم کے ساتھ راہِ تصوف پر چلنے اور مقصد کو حاصل کرنے کی اور بھی شرائط ہیں مگر علم وعمل اور شریعت وطریقت کا چولی دامن کا رشتہ ہے۔علم تو بلا عمل ہوسکتا ہے لیکن عمل بلا علم ممکن نہیں البتہ حصولِ علم کے ذرائع مختلف ہوسکتے ہیں۔

اولیاء کاملین جو مسند رُشد وہدایت پر فائز ہوئے انہوں نے علم قرآن وسنت ،علم فقہ اور علم معرفت حاصل کیا اور پھر عملی زندگی میں مجاہدات وریاضات سے حضور وقرب خداوندی میں آگے بڑھتے گئے جس کی انتہا نہیں، ایسی ایسی ریاضتیں ،مشقتیں اور نفس کشی کے لیے ایسے کٹھن ومشکل مراحل سے گزرے کہ آج کا غافل انسان سن کر اور پھر اپنی زندگی کی بے مائیگی وبے ذوق کیفیت کو دیکھ کر اسلاف کی عبادات وریاضات کو ہی شک کی نگاہ سے دیکھنے لگ جاتا ہے لیکن اللہ جل شانہٗ نے وقتاً فوقتاً ایسی قدسی صفات کو بھیجنے کی کریمانہ

عادت کو جاری رکھا ہوا ہے جو اسلاف کی مجاہدانہ ریاضتوں کی یادوں کو نہ صرف یہ کہ زندہ کر دیتی ہیں بلکہ اُن پر اُٹھنے والے شکوک وشبہات کا بھی اپنے عمل سے قلع قمع کر دیتے ہیں۔ ایسی ہی شخصیات میں سے عصر رواں کی ایک عبقری وتاریخ ساز شخصیت خواجہ فقیر محمد الحسنی الباروی قدس سرہٗ زیب مسند آستانہ عالیہ، پیر بارو شریف علیہ الرحمۃ کی تھی جو ۱۹۴۰ء کو پیدا ہوئے (۳) اور دسمبر ۲۰۱۴ء کی ستائیسویں تاریخ کو حجاز مقدس کے سفر کے دوران چار ربیع الاوّل ۱۴۳۶ھ کو ۷۴ برس کی عمر میں اس جہانِ فنا سے عالم بقا کی طرف انتقال فرما کر لاکھوں مریدین، متوسلین، جملہ حاملین عقائد اہل سنت وجماعت کے علاوہ پورے علمی ماحول کو سوگوار فرما گئے۔ (۴)

احیاء سنت کی اس چلتی پھرتی تحریک کی زندگی کا ورق ورق عبادت، جہد مسلسل، سعی پیہم، غیرت وحمیت، سخاوت وعنایت، زہد وتقویٰ، بے باک صداقت، قطع شرک وبدعت اور ترویج عقائد اہل سنت سے عبارت ہے۔

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ خواجہ فقیر محمد نور اللہ مرقدہ، تحریک امام ربانی، مجدد الف ثانی علیہ الرحمۃ کے تسلسل اور آپ کی فکر کی ترویج کا نام ہے۔ مبدء فیض نے اس خلیق وشفیق ذات میں سلاسل طریقت کی خوبیوں کو یکجا فرما کر تصوف کا گویا ایک حسین گلدستہ بنا دیا تھا۔

سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ کی روحانی امانتوں کے امین ہونے کے باوجود دیگر سلاسل طریقت کے احترام کا جو آپ نے عملی درس دیا ہے وہ آج کے دور کے ہر مسند نشین کے لیے از حد ضروری ہے۔ ورنہ انہیں سلاسل کی کوکھ سے مستقل مسالک کے جنم لینے کا خطرہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تمام سلاسل طریقت کے مخلص بزرگوں نے خواجہ فقیر محمد علیہ الرحمۃ کی کمی کو شدت سے محسوس کیا ہے اور آپ کی سطح زمین سے زیر زمین قدم رنجہ فرمانے کو اپنے ہی سلسلہ کا عظیم صدمہ قرار دیا ہے۔ (۵)

بے شمار کرامات ومکاشفات کے ظہور وصدور کے باوجود آپ کی فکر کا قبلہ الاستقامۃ فوق الکرامۃ رہا۔ عمل واطاعت شعاری میں آپ کوہِ عزیمت اور جبل استقامت تھے جو صدیقی رقت قلبی رکھتے تھے لیکن میدانِ شریعت میں غیرتِ فاروقی کے دریا کی بپھری ہوئی لہر کی مانند تھے۔ شرمیلے ایسے کہ حیاء ذوالنورین کا عکس تھے، لیکن حق گوئی میں کربل حسین کے مقلد تھے۔ حلقہ یاراں میں تو ابریشم سے بھی نرم مگر رزمِ حق وباطل میں سیف حیدری بھی سونتنا جانتے تھے، گویا میدان میں ڈٹنا شیر خدا سے سیکھا تھا۔

اصلاح فساق میں فیاضِ مطلق نے آپ کو خاص مہارت عطاء فرمائی تھی، ہزاروں بے راہ رؤں کو جادۂ حق پہ گامزن فرمایا۔ بے شمار بدعقیدگی کے خزاں رسیدہ روافض، خوارج، ہندوؤں، قادیانیوں اور بدعملی

وبدکرداری کے عفریت سے ڈسے ہوؤں کو حق وصداقت کی روشنی، عمل وکردار کی چاشنی، محبت الٰہی اور عشق مصطفوی کی وہ میٹھی میٹھی چاندنی عطا فرمائی جو آج کے دور کی سب سے اہم ضرورت ہونے کے باوجود عملاً عنقاء ہوتی جارہی ہے۔

آپ نے زبانی تبلیغ سے کہیں زیادہ عملی تبلیغ فرمائی ہے۔ سیرت طیبہ سرور عالم ﷺ کے ہر گوشہ کی خوشبو آپ کے جسم سے سونگھی جاسکتی تھی۔ محبت کے مذہب میں آپ بلا عمل دعویٔ محض پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔ آپ کا مسلک عشق یہ تھا کہ عشق کبھی عاشق کو اپنے محبوب ومعشوق کی اداؤں سے آنکھیں چرانے نہیں دیتا۔ محبت تو محبوب کے ہر عمل کو اپنے عمل کا قبلہ وکعبہ بنانے کا تقاضا کرتی ہے کسی حسین سے محبت کا حسن یہ ہے کہ اس کی ہر ادا حسین لگے۔ محبت جب سراپا حسن سے ہو تو اداءِ حسن بھلا محب سے کب تشنہ ادا رہ سکتی ہے، محبوب اگر بھول کر بھی کوئی عمل کر بیٹھے تو محب اس ادا کو جان جان کر ہزار بار ادا کرنے کو بھی اپنی محبت کی معراج سمجھتا ہے۔

حضرت خواجہ علیہ الرحمۃ میں تصوف وولایت کی ہر خوبی بطریق اتم موجود تھی۔ آپ کی خوبیوں میں علم دوستی، علماء پروری اور طلبہ نوازی بہت عیاں تھی۔

خدمت علم وفن محض تصنیف وتالیف، تدریس وتقریر اور ترتیب وتدوین ہی میں منحصر نہیں ہے۔ علم کے شجر سایہ دار کو پھلنے پھولنے، فروغ پانے، اس کی نشو ونما اور افزودگی وروئیدگی کا ماحول مہیا کرنا، نقوش علم کے لیے ترغیب وتحریص سے سینوں کے صفحات کو اثر پذیری کے لیے تیار کرنا، صاحبان علم وحاملانِ فن کی عزت وحوصلہ افزائی کرنا، کھلے بندوں کسی صاحب منصب کا صفت علم کے موصوفین کی قدر کرنا اور علوم وفنون کے گلستاں خوشبودار کے لیے زرخیز زمین کا مہیا کرنا بھی یقیناً ترویج علم اور اشاعتِ فن کے مترادف ہے بلکہ اساس ترویج ہے۔ طلبا کی ضروریات کا اہتمام ہو، علمی درس گاہوں کا قیام یا پھر فروغ علم کے مراکز کا انتظام، یہ سب علمی خدمات کی سنہری وروشن شکلیں ہیں اور ان سب اُمور کو حضرت غریب نواز علیہ الرحمۃ کے نمایاں کارناموں میں اوّلیت والویت حاصل ہے۔

علماء کی قدر دانی کا عالم یہ تھا کہ بقول صاحب زادہ محمد قاسم دام اقبالہ، جب انہوں نے نحو کی ''الکافیہ'' شروع کی اور حضرت کو عرض کیا گیا تو فرمایا: ''میرا دل چاہتا ہے کہ میں اپنے بیٹے کے قدم چوم لوں'' اور یہ صرف زبانی جمع خرچ والی بات نہ تھی بلکہ ایک موقع پر شاداب کالونی فیصل آباد میں قدم رنجہ فرما تھے کہ علامہ محمد رفیع باروی نے عرض کیا کہ یہ مولانا نصرالدین سیالوی، علامہ محمد اشرف سیالوی کے فرزند، عالم دین اور لائق مدرس

ہیں۔ پھر کیا تھا مولانا نصیر الدین کے قدم تھے اور حضرت خواجہ علیہ الرحمہ کے ہاتھ۔ مریدین ومتوسلین کی بہت بڑی تعداد انگشت بدنداں تھی کہ لاکھوں مریدین وسالکین جن کے جوڑوں کو اپنے سروں کا تاج بنانے کے لیے تڑپتے ہیں، آج عظمت علم کے سامنے اُس مینارِ عظمت نے اپنا سر جھکا کے علم دین کی عظمت کو ہم آغوش ثریا فرمادیا ہے اور امام ربانی علیہ الرحمۃ کے اس قول مبارک کی عملی صورت بن کر پیش فرمادی کہ طریقت شریعت کی خادم ہے۔(۲)

علم وفضل کو خراج عقیدت پیش کرنے کا یہ انداز شاید ہی کسی شیخ طریقت کے ہاں دیکھنے کو ملے۔ علامہ محمد اشرف سیالوی علیہ الرحمۃ آخری چند سال چھوڑ کر ہر سال دربارِ عالیہ پر عرس کی تقریبات میں خطاب کے لیے مدعو ہوتے، دیگر کانفرنسز میں اُن کا خصوصی خطاب ہوتا اور حضرت غریب نواز علیہ الرحمۃ سے بہت ہی قلبی محبت کرتے اور اس بات کا برملا اظہار کرتے کہ علماء کے حصے میں تو صرف ایک ہی پیر آیا ہے یعنی خواجہ فقیر محمد زید فیوضہ جنہوں نے علماء کی قدر افزائی کا حق ادا کر دیا ہے بلکہ علماء کو مقروض کر چھوڑا ہے۔ حضرت غریب نواز علیہ الرحمۃ کے فرزند اکبر اور مسند نشین حضرت علامہ حافظ محمد حسن باروی دام سرہٗ نے بتایا کہ ایک مرتبہ علامہ سیالوی مرحوم آستانہ عالیہ پر حاضر تھے، میں نے کھانا پیش کیا چونکہ کثرت مطالعہ کی وجہ سے ضعف گردن کا عارضہ آپ کو لاحق تھا اس لیے میں خود روٹی کے لقمے توڑ توڑ کر آپ کو پیش کر رہا تھا، ایک آدھ مرتبہ علمی محبت نے جوش مارا تو میں نے لقمہ خود آپ کے منہ میں پیش کیا، بس پھر کیا تھا کہ آنکھوں سے سیل اشک رواں ہو گئے۔ میں نے عرض کیا: حضور! کیا ہوا خیریت تو ہے، یہ موقع رونے کا تو نہیں؟ فرمایا: صاحب زادہ صاحب! دعائیں دو علماء پرور اور علم نواز اپنے والد گرامی کو جنہوں نے آپ کی تربیت فرمائی ہے اور علم وفن کی محبت کوٹ کوٹ تمہارے اندر بھر دی ہے۔ ورنہ پیروں کے آستانوں پہ اور صاحب زادوں کے ہاں علماء کو کون پوچھتا ہے؟ اور آج کل تو جاہل وبے علم پیروں اور اُن کے بے لگام صاحب زادوں نے علماء کو اس قدر بے قدر کر دیا ہے کہ لوگ علم دین پڑھنے کے بجائے جہالت کی دو چادریں لپیٹ کر رہبری ومریدی کی دکان چمکانے کو ترجیح دیتے، ایسے میں ایسی عزت افزائی عظیم باپ کی عظمت کی کھلی ہوئی دلیل ہے۔

اس جیسے بے شمار واقعات ہیں کہ حضرت علیہ الرحمۃ نے علماء کرام کو کھلے بندوں اتنا احترام واکرام دیا کہ لوگوں کے دلوں میں علم کی محبت پیدا ہوئی اور انہوں نے حصول عزت کے لیے اپنے بچوں کو طلب دین کے لیے وقف کیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آپ کی اس عملی تحریک سے ہزاروں حفاظ، قراء، علماء، مفتیان، مدرسین اور مبلغین تیار ہوئے۔ خلق خدا دور دور سے دعاء کرانے کے لئے آپ کے پاس حاضر ہوتی لیکن آپ بسا اوقات

علماء بلکہ طلبہ سے فرماتے کہ تم دعا کرو حقیر سمیت کئی طلبہ شرمندگی سے ڈوب ڈوب جاتے، جب آپ اصرار سے فرماتے کہ تم دعاء کراؤ، میں آمین کہتا ہوں۔

طلبہ دین کا بے حد احترام فرماتے، مولانا محمد منظور باروی آف فتح پور پاؤں کی طرف حاضر خدمت تھے، آپ نے پاؤں سیدھے کرنے کا ارادہ فرمایا تو ان کو اُٹھ کر دوسری طرف بیٹھنے کا حکم فرمایا۔ انہوں نے عرض کیا کہ آپ کے قدموں میں بیٹھنا میرے لیے سعادت ہوگی، آپ نے فرمایا: آپ دین کے طالب علم ہیں آپ کی طرف پاؤں کرنا بے ادبی ہے۔

آپ کے فرزند محمد قاسم حسین نے بچپن میں کسی بات پہ ایک حفظ کے طالب علم کو تھپڑ مار دیا تو وہ رونے لگا۔ مزار مقدس حضرت بارو علیہ الرحمۃ پر حاضر تھے، حضرت غریب نواز علیہ الرحمۃ کے آنے کا وقت تھا۔ صاحب زادہ صاحب نے اُسے خاموش کرانے کی بہت کوشش کی، پیسوں کا لالچ دیا کہ کہیں خواجہ غریب نواز علیہ الرحمۃ کو پتہ نہ چل جائے لیکن اسی ناکام کوشش میں حضرت صاحب علیہ الرحمۃ مزار مبارک میں تشریف فرما ہوئے اور بچے کو روتا دیکھ لیا۔ اُس سے پوچھا کہ کس نے مارا ہے؟ اُس نے یا کسی دوسرے طالب علم نے عرض کیا کہ صاحب زادہ قاسم حسین نے! فرمایا: اُسے بلاؤ! صاحب زادہ صاحب تب تک مزار مبارک سے کھسک گئے تھے، جب بلانے پر حاضر ہوئے۔ آپ نے فرمایا: تم نے ایک حافظ قرآن، دین کے طالب علم اور مسافر بچے کو مارا ہے؟ فرمایا: بیٹا! پیری مریدی اپنی جگہ لیکن تم نے ایک مہمان رسول اللہ ﷺ کو مار کر اُسے رنجیدہ کیا ہے، آگے بڑھو، سب کے سامنے اس سے معافی مانگو۔ بقول صاحب زادہ صاحب جرأت انکار کی تو مجال ہی نہ تھی، اور نہ ہی اس میں سبکی محسوس کی۔ میں نے آگے بڑھ کر سب مریدین وحاضرین کے سامنے ہاتھ بھی جوڑے اور پاؤں کی طرف جھک بھی گیا، لیکن حضرت خواجہ غریب نواز علیہ الرحمۃ نے اسی پر اکتفاء نہ کیا بلکہ فرمایا: بیٹا! میں بھی تم سے معافی چاہتا ہوں۔

جس شیخ نے اپنے صاحب زادگان کی اس انداز میں تربیت فرمائی ہو، طلبہ کی اس قدر عزت افزائی اور علماء کے وقار کو بلند کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ فرمایا ہو، اُس کے چلے جانے سے علمی حلقے کا احساس یتیمی تو ایک فطری امر ہے۔

علماء ومشائخ کا جو آپ پر اعتماد تھا اس کی جھلک دو واقعات سے عیاں ہو جائے گی۔ سید احمد سعید کاظمی علیہ الرحمۃ سے جب کوئی مزید اسباق سلوک کے لئے عرض کرتا تو آپ اکثر اُسے حضرت خواجہ فقیر محمد دامت برکاتہم کی طرف بھیجتے، آپ کے ختم قل شریف کے موقع پر مولانا محمد یوسف سعیدی نے بیان کیا کہ وہ حضرت

کاظمی علیہ الرحمۃ کے مرید ہوئے۔ اسباق کے لیے عرض کیا، چند مختصر وظائف تلقین فرمانے کے بعد فرمایا کہ مزید اسباق کے لیے خواجہ فقیر محمد دامت فیوضہ کے پاس حاضر ہوجاؤ۔ سید کاظمی چشتی تھے، جب کہ حضرت خواجہ علیہ الرحمۃ نقشبندی مجددی۔ اگرچہ آپ کو سلاسل اربعہ میں خلافت حاصل تھی، لیکن عملاً ترویج واشاعت سلسلہ نقشبندیہ کی فرماتے۔ حضرت کاظمی علیہ الرحمۃ کا اپنے مریدین کو تربیت کے لیے آپ کے پاس بھیجنا آپ کے روحانی مقام رفیع کے اعتراف اور آپ پر اعتماد کی صریح دلیل ہے۔

امام الشاہ احمد نورانی علیہ الرحمۃ جو جامع شریعت وطریقت تھے اور مسند ولایت پر فائز تھے، وہ بھی حضرت خواجہ باروی علیہ الرحمۃ سے بہت گہرا قلبی تعلق اور اعتماد کا رشتہ رکھتے تھے، کچھ عرصہ حضرت نورانی میاں علیہ الرحمۃ اور مجاہد ملت علامہ عبدالستار خان نیازی علیہ الرحمۃ کے درمیان سیاسی آراء میں اختلاف ہوا اور جمعیت علماء پاکستان دوحصوں ''نورانی و نیازی'' میں بٹ گئی۔ حضرت غریب نواز علیہ الرحمۃ جو مذہبی محبت وغیرت میں اپنی مثال آپ تھے، کو بہت دلی صدمہ ہوا۔ چنانچہ آپ نے اتحاد قائدین کے لیے چوک اعظم میں سنی کانفرنس کا اہتمام فرمایا۔ اس میں اتحاد اہل سنت کی دردمندانہ اپیل کی گئی۔ اور سب سے پہلے اتحاد کے لیے ایک کمیٹی وجود میں آئی جس میں مقتدر علماء کرام کو شامل کیا گیا، یہاں تک کہ اس کمیٹی میں علامہ عطاء محمد بندیالوی علیہ الرحمۃ بھی بطور ممبر بعد میں شامل ہوئے۔ اس اتحاد کی کوشش کا ثمر ہی تھا کہ بالآخر نورانی و نیازی اتحاد کا نتیجہ چند سالوں بعد برآمد ہوا۔ قائد اہل سنت پنجاب کے دورے پر تھے تو حضرت خواجہ صاحب علیہ الرحمۃ نے آپ سے ملاقات فرمائی اور فرمایا کہ آپ مہربانی فرمائیں اور اتحاد کی کوئی سبیل نکالیں۔ امام نورانی علیہ الرحمۃ نے فرمایا: خواجہ صاحب! آپ میرے نمائندے ہیں اور آپ کو میری طرف سے مکمل اختیار ہے، آپ اتحاد کے لیے جو فیصلہ کریں گے مجھے قبول ہوگا۔ حضرت نورانی میاں علیہ الرحمۃ نے اتحاد اہل سنت کے لیے تمام کوششوں کا احترام فرمایا۔

ان کے ساتھ مکمل تعاون فرمایا لیکن کسی معین شخصیت پر اس قدر اعتماد فرماتے ہوئے ایسا بھرپور اختیار حضرت غریب نواز علیہ الرحمۃ کے علاوہ کسی کو نہ دیا۔ ان بزرگ علماء کے علاوہ جن علماء سے آپ کے قریبی اور احترام کے تعلقات رہے اُن میں شیخ الاسلام خواجہ قمر الدین سیالوی، پیر آف گولڑہ شریف، پیر آف تونسہ شریف، پیر آف بھکی شریف، پیر آف کرمانوالہ شریف، پیر آف شرقپور شریف، پیر آف موسیٰ زئی شریف، پیر آف مرشد آباد شریف، محدث اعظم پاکستان علیہم الرحمۃ، علامہ عطاء محمد بندیالوی، علامہ عبدالرشید جھنگوی، علامہ عبدالرشید سمندری، علامہ محمد شریف رضوی، علامہ منظور احمد نواں جنڈاں والا، علامہ غلام علی اوکاڑوی، سید

محمود احمد رضوی، علامہ منظور احمد فیضی، علامہ فیض احمد اویسی، ملک محمد اکبر ساقی، علامہ عبدالمصطفیٰ ازہری، علامہ خدا بخش اظہری، علامہ خورشید احمد ظاہر پیر، علامہ حامد علی خان ملتان شریف، علامہ صوفی حامد علی لیہ، مولانا غلام محمد تونسوی (جو کہ آپ کے ہاتھ پر بیعت بھی تھے) علیہم الرحمۃ۔ علامہ محمد الیاس عطار قادری امیر دعوت اسلامی ، مفتی منیب الرحمن کراچی، علامہ محمد اشرف آصف جلالی، علامہ سعید احمد اسعد، علامہ عبدالمجید سعیدی، علامہ عبدالستار خاں سعیدی، علامہ پیر سید ریاض حسین شاہ، علامہ سید مظہر سعید کاظمی و برادران، علامہ محمد اکرم شاہجمالی، علامہ مفتی محمد خان قادری، علامہ شوکت علی سیالوی، علامہ مفتی محمد رفیق الحسنی، مفتی فضل الرحمن وہووا، تقریباً تمام جید و معروف علماء کرام سے آپ کا تعلق اور باہمی پیار رہا۔

حضرت خواجہ غریب نواز علیہ الرحمۃ نے بیسیوں مدارس دینیہ اور مساجد کی بنیاد رکھی جن میں ہزاروں طلبہ و طالبات مستفید ہو رہے ہیں۔ آپ کی ترغیب و تحریص سے بلا مبالغہ ہزاروں حفاظ، قراء، علماء، خطبا، مدرسین، مبلغین، مصنفین تیار ہوئے جو دنیا کے کونے کونے میں خدمت دین میں مشغول ہیں۔ آپ کی گفتگو بہت سادہ اور پر مغز ہوتی، بسا اوقات ایسے سادہ ملفوظات کا اظہار ہوتا جن میں علم و معرفت کا ایک ٹھاٹھیں مارتا سمندر رواں ہوتا، چند ملفوظات مشتے از خروارے کے طور پر ذکر کیے جاتے ہیں:

۱۔ صاحب زادہ خواجہ محمد حسن صاحب سے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ اور اس کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے اسماء پکارو تو ممکنہ القاب و آداب کے ساتھ پکارو، کیوں کہ جب کسی سے کچھ مانگتے اور سوال کرتے وقت موصوف کو اچھے الفاظ، القاب اور صفات و عادات کے ساتھ یاد کریں تو وہ نہ صرف یہ کہ مسئولہ چیز عطا کرتے ہیں بلکہ فضل و احسان کا معاملہ فرماتے ہیں اور سب سے زیادہ اور حقیقتاً ہم جن ذوات قدسیہ کے محتاج و فقیر ہیں اُن کی شان رفیع کا تقاضا ہے کہ اُن کے اسماء محبت و اخلاص سے لیں تا کہ اُن کا دریائے کرم جوش میں آئے اور ہماری بگڑی بن جائے۔

۲۔ حضرت صاحب زادہ صاحب سے فرمایا: جب کسی مزار، آستانِ اقدس، یا بزرگ کے دربار پر حاضر ہوں تو سب سے پہلے اس کی اولاد امجاد میں سے کسی صاحب زادے سے مل کر اور اُن کی خدمت کر کے حاضری دو، اس طرح صاحب مزار کی اولاد کے ساتھ اگر پیار، محبت اور احترام سے پیش آ ؤ گے تو صاحب مزار کی روح خوش ہوگی اور پھر جب اس بزرگ کی بارگاہ میں حاضری ہوگی تو ان کی خصوصی توجہ، التفات اور فیض وافر سے بہرہ مندی نصیب ہوگی۔

۳۔ قاری خلیل احمد باروی علیہ الرحمۃ کے جنازے کے موقع پر ایک عمر رسیدہ شخص نے عرض کیا کہ مجھے ایک

عرصہ ہو گیا ہے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہوئے لیکن قلب جاری نہیں ہوا، فرمایا: تم ذکر کرتے رہو، ہمیں ذکر کا حکم ہے اور یہ ذکر خود مقصود و مطلوب ہے۔ فرمایا: جیسے کسی چراغ پہ اوندھا برتن رکھ دیا جائے تو اس کی روشنی برتن کے اندر چھپ جائے گی لیکن ختم نہ ہوگی تو اسی طرح کسی سبب سے قلب کے نور پر کوئی پردہ حائل ہو جاتا ہے جب بھی یہ پردہ دور ہوگا تو پیچھے ذکر الٰہی کا نور ہی ہوگا اور باطن اُس نور سے منور ہوگا اس لیے ذکر کبھی نہ چھوڑو چاہے قلب میں اس کا اثر محسوس نہ بھی ہو۔ یعنی ذکر الٰہی کا قلب میں احساس ضروری نہیں، ذکر پہ استقامت ضروری ہے۔

۴۔ آپ نے فرمایا جاہل کی مثال ٹنڈ انڑیں (ایک نجس کیڑے) کی ہے جو اپنے وجود کے ساتھ گندگی اور نجاست کے گولے کو ایک جگہ سے دوسری جگہ دھکیلتا رہتا ہے جب کہ عالم دین حامل نور ہوتا ہے۔

۵۔ بعض غلاموں سے اگر کسی کام میں سستی ہوتی تو فرماتے کہ یہ فلاں آدمی کہتا ہے کہ میں سمجھ دار ہو گیا ہوں مجھے چرانے کے لیے بکریاں لے کر دو۔ بظاہر یہ ایک مزاح تھا لیکن راقم کے فہم میں اس بات کی طرف اشارہ ہوتا کہ یہ آدمی خلافت کا متمنی ہے اور سمجھتا ہے کہ میں مریدوں کو سنبھالنے کے قابل ہو گیا ہوں اور ان کی تربیت کی صلاحیت کا حامل ہو گیا ہوں لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ کیوں کہ اعلانِ نبوت سے قبل تقریباً تمام انبیاء کرام علیہم السلام نے بکریاں چرائی ہیں اور اللہ جل شانہ نے ہر نبی کو اُمت کی تربیت کے لیے یہ کام سونپا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض انسانوں میں بھی بہائم جیسی صفات وعادات ہوتی ہیں جن کو سنبھالنا، سنجیدگی ومتانت اور انسانی حدود واقدار میں رکھنا جانوروں کی نگہبانی جیسا مشکل اور صبر آزما کام ہے۔

۶۔ ایک مرتبہ راقم سے فرمایا: ہمارے بزرگ اور مشائخ علماء وطلبہ کو اسباقِ سلوک نہیں بتاتے تھے، اس لیے کہ سلوک بھی ایک ''ٹھرک'' (دائمی جنون) ہے، اگر طلبہ وعلماء کو اس پر لگا دیا جائے تو وہ علوم دینیہ کے پڑھنے پڑھانے پر پوری توجہ نہیں دے سکتے۔ حالانکہ یہی علوم دینیہ ہی طریقت ومعرفت کی اساس ہیں اور جو وقت عموماً اوراد و وظائف، مراقبہ وتسبیحات کا ہوتا ہے، وہی وقت مطالعہ وتکرار اور تعلیم وتدریس کا ہوتا ہے۔ تدریس کے بے تاج بادشاہ علامہ عطاء محمد بندیالوی نوراللہ مرقدہ نے ایک مرتبہ حضرت خواجہ محمد عبداللہ پیر بارو سرکار علیہ الرحمۃ سے عرض کیا تھا کہ ''میرے پاس قال ہے اور حال نہیں ہے'' تو آپ نے جواب میں فرمایا: مولانا! یہی تمہارا قال ہی تمہارا حال ہے۔ بس ان جملوں سے گویا آپ نے چراغ حال کو روشن فرما دیا اور پھر علم وفضل کا پورا جہان جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت بندیالوی علیہ الرحمۃ کے قال کو ہی اُن کا حال بنا دیا اور وہ قرآن، حدیث، فقہ واصول کی تدریس میں ایسے ڈوبے کہ آخری سانسیں بھی قال اللہ جل جلالہ وقال

الرسول ﷺ کے ساز سے متحرک تھیں اور زبان اسی وظیفہ عشق ومحبت سے تر تھی۔

۷۔ راقم ایک شب ایک محفل قراءۃ کے بعد قاری غلام رسول لاہور علیہ الرحمۃ کے ہمراہ حضرت بار وفقیر علیہ الرحمۃ کے پاس حاضر ہوا، رات کا تقریباً آدھا حصہ بیت چکا تھا، دل میں خیال آیا کہ امشب بقیہ حصہ تنہائی میں مزار پرانوار پہ حاضری میں گزارا جائے اور انوار وتجلیات الٰہیہ خاصہ جو قبور صالحین پر ابر کرم بن کر برستی ہیں، سے کچھ کسب فیض کر کے آلودگئی معاصی سے نجات کا سامان کیا جائے۔لیکن جب مزار شریف میں قدم رکھا تو حضرت غریب نواز خواجہ علیہ الرحمۃ فقر وعجز کی تصویر بنے صاحب مزار کے قدموں میں مراقب تھے۔ راقم نے بہت ہی احتیاط سے مزار شریف کے سامنے بیٹھ کر تلاوت قرآن حکیم دل ہی دل میں شروع کر دی۔ جب کچھ وقت گزرا تو فرمایا بیٹا سالک کے لیے سب سے بہتر یہ ہوتا ہے کہ برکت کے لیے قرآن حکیم کی تلاوت کر کے زیادہ وقت اپنے بزرگوں کا دیا ہوا سبق سلوک (اسم ذات، نفی واثبات اور مراقبہ وغیرہ) پہ دھیان دیا جائے اور اس کو پڑھا جائے (کیوں کہ طالب علم کے لیے باقی مشاغل سے پہلے اپنا نصابی سبق یاد کرنا زیادہ ضروری ہوتا ہے) راقم نے جھوٹا موٹا سر جھکا لیا، جب صبح ہوئی تو اپنے قریبی غلام سے فرمایا: قاری صاحب تو ساری رات مزار شریف پہ ذکر وورد میں مشغول رہے ہیں، حالانکہ راقم تو رات کا بہت سارا حصہ محفل میں گزار کر اور پھر تقریب اکل وشرب سے فارغ ہو کر تقریباً ایک گھنٹے کے سفر کے بعد آستانِ فیض پر حاضر ہوا تھا جب کہ زلف شب اس کی کمر سے بھی تجاوز کر رہی تھی اور خود نہ جانے کب سے مراقب تھے، لیکن ذرۂ خاک کی حوصلہ افزائی اور بندہ نوازی کے لیے ایسا فرمایا تا کہ مزید اس جادۂ نور پر چلنے کی ترغیب وتحریص ہو، لیکن غفلت، شیطنت، معصیت اور مشاغل دنیوی کب یہ موقع بار بار دیتے ہیں۔

حقیقی صوفی کی زندگی کا ایک بڑا مقصد اپنے کردار کی تطہیر کے بعد اپنے جلیس ومصاحب اور متعلق وعقیدت مند کی کردار سازی ہے، جو شخص سیرت سازی میں اپنی ذات تک محدود ہو اور دوسرے کے متعلق چشم پوشی کا مرتکب ہو وہ راہِ سلوک کا سالک اور جادۂ طریقت کا طالب تو ہو سکتا ہے، کسی سالک وطالب کا مرشد ومربی نہیں ہو سکتا، ہر کام کی طرح طالبین حق کی تربیت وتعلیم بہت ہی صبر آزما اور حکمت ودانش مندی نیز موعظ حسنہ کی متقاضی ہے۔حضرت خواجہ فقیر محمد علیہ الرحمۃ کا طریق تربیت واصلاح بہت سادہ، پر اثر، عام مثالوں سے آراستہ اور حکمت ودانش مندی سے عبارت تھا۔ داڑھی منڈے سے فرماتے: عورت سیدہ طیبہ رضی اللہ عنہا کی سنت پر عمل کرتی ہے، اپنے سر بال منڈوا کر گندے پانی کی نالی میں نہیں پھینکتی بلکہ کنگھی کرتے وقت اُس کے جو بال جھڑتے ہیں انہیں بھی کسی دیوار کے شگاف میں چن دیتی ہے اور تم آئے روز فخر انبیاء ﷺ کی

سنت (بلکہ واجب) کی توہین کرتے ہو، اس کا قتل عام کرتے ہو، اہانت سنت کرنے والے کو پیسوں کی صورت میں انعام دیتے ہو اور پھر سنت مبارکہ کے بالوں کو گندی جگہ پھینکوا دیتے ہو، تم سے تو عورت اچھی ہے۔ آپ جس چیز پر سب سے زیادہ زور دیتے وہ تحفظ عقائد تھا، آپ بیعت ہونے والے کو پہلا درس ہی گستاخانِ رسول، صحابہ کرام، اہل بیت اور اولیاء کاملین کے بے ادبوں سے دوستی، نیاز مندی، اُن سے رشتہ داری و تعلق سازی، ان کے پروگراموں میں شرکت اور ایسے تمام امور سے منع فرماتے جن سے اُن کے ساتھ کسی بھی قسم کا اثر پذیری کا تعلق قائم ہو سکنے کا امکان ہوتا۔

نماز، روزہ، زکوٰۃ وعشر، تلاوت قرآن حکیم، مدارس دینیہ، دینی مدارس کے طلبہ اور علماء کی تعظیم وتوقیر کا حکم فرماتے۔

درباروں پر اکثر لوگ عموماً مختلف اقسام کے مسائل، مصائب، منافرتوں اور امراضِ جسمانیہ کے لیے تعویذات لینے آتے ہیں بلکہ عوام میں پیری مریدی کا تصور ہی تعویذ گنڈے سے اُبھرتا ہے۔ دربارِ عالیہ حضرت پیر بارو شریف وہ واحد روحانی مرکز ہے جہاں تعویذات دیئے تو جاتے ہیں مگر پیری مریدی کی دکان چمکانے اور محض نذرانے بٹورنے کے لیے نہیں بلکہ اصلاحِ اعمال اور تربیت بندگان کے لیے۔ اس آستانِ فیض کے تعویذات بہت ہی پر اثر ہیں۔ خصوصاً مختلف اقسام کی امراض کے لیے حضرت سیدنا علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کی طرف منسوب تعویذ اور جسمانی دردوں، پھوڑے پھنسیوں اور وجع مفاصل کے لیے دم شدہ پتھر تو گویا تیر بہدف ہیں جو کم از کم اکیس دنوں اور زیادہ سے زیادہ اکتالیس دنوں کے لیے استعمال کرائے جاتے ہیں۔ لیکن ان کے لیے دو بنیادی ضروری اور پر زور شرطیں لگائی جاتی ہیں کہ یہ تعویذات اور پتھر اکتالیس دنوں تک نماز پنجگانہ پڑھ کر استعمال کیے جائیں اور مسلسل استعمال کیے جائیں نہ نماز میں ناغہ اور نہ ہی تعویذ وغیرہ کا ناغہ ہو ورنہ ان کا اثر نہیں ہوگا اور اگر ان میں ناغہ ہوا تو نہ صرف یہ کہ فائدہ نہ ہوگا بلکہ یہ عمل دوبارہ سے از سرِ نو شروع کرایا جائے گا۔

یہ بظاہر تو تعویذات کا استعمال ہے لیکن درحقیقت ہر ضرورت مند کا باطنی وروحانی اور عبدیت کا رشتہ اپنے مالک وشافیٔ حقیقی کے ساتھ جوڑ کر اس کی اصلاح کی مخلصانہ، دانشمندانہ اور پر حکمت کوشش ہے اور یہ بزرگان دین کا محبوب عمل ہے کہ جو انسان اتنے دنوں تک نماز کی پابندی کرے اُس میں مستقل نماز کی عادت بھی پیدا ہو جاتی ہے اور مسلسل اتنے دنوں تک بارگاہِ الٰہی میں عاجزی وانکساری سے دعا کرتے رہنے سے مصائب وتکالیف بھی ختم ہو جاتی ہیں اور یہی مرشد کامل کا حقیقی مقصد ہوتا ہے۔

آج کے دور میں خانقاہی نظام بہت ساری باتوں میں اپنی سابقہ روایات سے کج روی کا شکار ہے۔علم کو خانقاہی روایات کے گویا عملاً منافی قرار دیا گیا ہے۔منصب رشد وہدایت کے لیے کسی نصاب کی ضرورت نہیں رہی بس کسی پیر کا فرزند ہونا ہی کافی ہے۔خدمت خلق کے بجائے صرف خدمت مرشد ہی کا تصور پروان چڑھایا گیا ہے اور حاضرین کو مزارات پر حاضری کے لیے آداب وشرائط کا پابند بنانے کے بجائے شتر بے مہار بنا دیا گیا ہے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ حضرت خواجہ فقیر محمد الباروی علیہ الرحمۃ کے نقوش زندگی کو مشعل بنا کر نظام خانقاہی میں اصلاحات کی جائیں۔

○○○

حوالہ جات

۱۔ الاحزاب ۳۳:۷

آل عمران ۳:۸۱

۲۔ امام ربانی ، شیخ احمد فاروقی ،سرہندی، مکتوبات، جلد اوّل ،مکتوب ۱۰۸، کراچی: ایچ ایم سعید اینڈ کمپنی ، ۱۳۹۷ھ

۳۔ محمد حسن باروی، صاحب زادہ، فیوضات بارویہ، لیہ: مکتبہ بارویہ، ۱۴۱۶ھ، ص ۱۸۷

۴۔ محمد طاہر عزیز، مضمون: نالہء دل، مشمولہ: مجلہ، الفقیر ،لاہور: انجمن حسنیہ بارویہ، جلد ا، شمارہ: ۴، ربیع الثانی ۱۴۳۶ھ، ص ۹

۵۔ محمد فاروق القادری ، سید (پیر)، مضمون: امین امانت بارو، مشمولہ: مجلہ، الفقیر ،لاہور: انجمن حسنیہ بارویہ، جلد ا، شمارہ: ۴، ربیع الثانی ۱۴۳۶ھ، ص ۹

۶۔ امام ربانی، شیخ احمد فاروقی ،سرہندی، مکتوبات، ج ۲، مکتوب ۲۶۰

ابن الفارض شاعر صوفي

الدكتور كفايت الله همداني *

الدكتور حافظ محمد بادشاه **

Abstract:

Ibn-ul-Faridh was a great Egyptian poet. He possessed a refined sense soft heart and delicated thoughts. But he is known as a sufi poet and he is one of those eminent personalities who struggled and strived in this filed. In spite of that he had a heart full of deep feelings of love and his spiritual life was a real picture of splendid emotions and wonderful sentiments and he is famous as Sultan-ul-Aasheqeen (king of lovers.)

keywords:

Ibn-ul-Faridh, Egyptian, Poet, Spritual, Splended, Strived, Sentimenalts, Sultan-ul-Aashqeen.

إن التصوف ظاهرة دينية قوية، وانتشرت في الدول الإسلامية، وهي نزعة ذات الفرق الكثيرة في كل أنحاء العالم الإسلامي، وجذبت الكثيرين من العلماء والشعراء والأدباء ومنهم عمر بن الحسن المعروف بابن الفارض شاعر مصري الذي كان يتميز بصبغة صوفية في شعره حتى اشتهر بلقب سلطان العاشقين، وهذا المقال يتحدث عن حياته والاختلاف في تاريخ ولادته وأربعة أطوار من حياته، وسيرته وخلقه، وحياته الروحية.

---

* اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ عربی، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

** اسسٹنٹ پروفسیر شعبہ عربی، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

أبو القاسم عمر بن الحسن

كان ابن الفارض شاعراً وأديبا دقيق الحس، رقيق النفس مرهف الشعور، وكان صوفيا من أصحاب الرياضيات والمجاهدات، وأرباب الأذواق والمشاهدات، وكان إلى هذا كله محبا امتلأ قلبه بأعمق معاني الحب، وتعلقت جوانحه بأروع آيات الجمال، وكانت حياته الروحية مرأة صادقة تنعكس على صفحتها ما اختفى في باطنه من انفعلات أنيقة، وما فاض به قلبه من عواطف شريفة.

اسمه

"هو أبو حفص وأبو قاسم عمر بن الحسن علي بن المرشد بن علي الحموي الأصل، مصري المولد والدار والوفاة۔"(١)

أبوه

"كان أبوه من علماء الفقه والشريعة، قدم من حماة إلى مصر وصار يثبت الفروض للنساء على الرجال بين يدي الحكام ثم ولي نيابة الحكم فغلب عليه التقليب بالفارض."(٢)

وقال ابن خلكان: "والفارض بفتح الفاء وبعد الألف راء مفتوحة وبعدها ضاد معجمة، وهو الذي يكتب الفروض للنساء على الرجال."(٣)

مولده ونشأته

قال ابن خلكان: كانت ولادته في الرابع من ذي القعدة سنة ست وسبعين وخمسمائة بالقاهرة(٤)، وفي شذرات الذهب يقول ابن العماد في ذكر أبيه قائلاً:

"ثم ولد له بمصر عمر في شهر ذي القعدة سنة ست وستين وخمسمائة (٥٦٦هـ) فنشأ تحت كنف أبيه في عفاف وصيانة وعبادة وديانة بل زهد وقناعة وورع أسدل عليه لباسه وقناعة فلما شب وترعرع اشتغل بفقه الشافعية وأخذ الحديث عن ابن عساكر وعنه الحافظ المنذري وغيره".(٥)

يظهر من النص السابق أن ابن الفارض عند ما شب وترع تثقف بذلك اللون السائد من

الثقافة الدينية المعروفة في عصره، وفي البيئة المصرية، وهو الفقه الشافعي والحديث الشريف، وأنه في نشأته الأولى كان متأثرا بهذا الروح الديني السائد في عصره، وبهذه النزعة الصوفية التي كانت من أخص خصائص ذلك العصر من ناحية، ومن أبرز الصفات التي امتاز بها والده من ناحية أخرى.

"وليس من شك في أن نشأته كان لها أثرها القوي في تهذيب نفسه وترقيق طبعه وتصفية قلبه بحيث جعلت منه فيما بعد رجلاً قوى الخلق نقي الضمير، خليقا بإجلال الملك الكامل له، وإقبال الخاصة والعامة عليه."(٦)

وقد ورد اختلاف في تعيين تاريخ ولادته ويظهر هذا لمن يتبع المصادر القديمة التي تصددت لترجمته ويمكن لنا سرد هذه النصوص كما يلي:

"يذكر ابن خلكان: إن ابن الفارض ولد في الرابع من ذي القعده سنة 576 هـ بالقاهرة وتوفي بها يوم الثلاثاء الثاني من جمادي الأولى سنة 632 هـ ودفن من الغد بسفح المقطم."(٧)

"يقول ابن أياس: أن ابن الفارض ولد بالقاهرة في الرابع من ذي القعدة سنة ٥٧٧هـ وتوفي بها في الثاني من جمادي الأولى سنة ٦٣٢ هـ وله من العمر أربع وخمسه سنة وستة أشهر."(٨)

"ويعين ابن تغري بردي: الرابع من ذي القعدة سنة ٥٧٦ هـ على أنه تاريخ لمولد ابن الفارض، كما يعين الثاني من جمادي الأخرى سنة ٦٣٢ هـ على أنه تاريخ لوفاته."(٩)

"أما ابن العماد فيذهب إلى أن مولد شاعرنا كان في ذي القعدة سنة ٥٦٦ هـ وأن وفاته كانت في جمادي الأولى سنة ٦٣٢ هـ عن ست وخمسين سنة إلا شهراً."(١٠)

ويلاحظ من النصوص السابقة أنها تتفق على الشهر الذي ولد فيه ابن الفارض، ولكن ورد الاختلاف في السنة التي فيها ولد مع أنها تجتمع على السنة التي توفي فيها.

"إن ابن العماد بقوله إن الفارض ولد في ذي القعدة سنة ٥٦٦ هـ وإنه عند وفاته كان له من العمر ست وخمسون سنة إلا شهراً، وبذكر ترجمة ابن الفارض بين تراجم الذين توفي سنة ٦٣٢ هـ، إنما يخالف ما أجمع عليه المترجمون

الأخرون وإذا استثنى منهم ابن تغري بردي وهو أن وفاة شاعرنا كانت في الثاني من جمادي الأولى سنة ٦٣٢ هـ فلو كان صحيحا ما رواه ابن العماد عن السنة التي ولد فيها ابن الفارض، وعن السنة التي توفي فيها، وعن مقدار عمره عند وفاته ولو أجرينا عملية حسابية يسيرة معتمدين على هذه المعلومات التي يقدمها صاحب الشذرات لترتب على هذا أن وفاة ابن الفارض كان في شوال سنة ٦٢٢ هـ لا في جمادي الأولى ٦٣٢ ليكون متمشيا مع أبسط قواعد المنطق والحساب من ناحية ومتفقا مع أشبه الثقاة من المترجمين في هذا الصدد من ناحيةأخرى۔"(١١)

يمكن لنا تقسيم حياة ابن الفارض إلى أربعة أطوار وهي:

الطور الأول

مهما يكن تاريخ ولادته فإن الطور الأول من حياته يدل على أنه تثقف بالعلوم الشائعة السائدة في البيئة المصرية آنذاك، وكل هذا مهد نفس ابن الفارض وهيأها لسلوك طريق الصوفية، وجعل من صاحبها زاهدا متجرداً على نحو ما يبدو لنا في طوره الثاني، لماذا تزهد شاعرنا وتجرد وما الذي حبب إليه الانقطاع إلى الله فذلك مايذكره السيوطي من أن ابن الفارض كان من الفقهاء الأعلام وقاضيا وولي الأحكام، وأنه دخل الجامع يوما لصلاة الجمعة والخطيب يخطب فوجد شخصا يغني فنوى تأديبه سرا فلما انقضت الصلوة وانتشر الناس خرج ابن الفارض فناداه الشخص المغني أن أقبل فلما أقبل أنشده:

قسم الإله الأمر بين عباده
فالصب ينشد والخلي يسبح
ولعمري التسبيح خير عبادة
للناسكين وذا القوم يصلح
فكان هذا سبب زهده(١٢)

"على أننا إن قبلنا ما يحكيه السيوطي عن سبب زهد ابن الفارض فإننا لا نستطيع بحال ما أن نوافقه على أن شاعرنا كان في ذلك الطور من أطوار حياته فقيها

وقاضيا ولي الأحكام، لا سيما أن ما وفقنا عليه من المراجع لم يذكر فيه شيئ يثبت صحة ما يذهب إلي السيوطي هنا، ولذا كان لا بد من أن تبقى هذه المسألة معلقة إلى أن يظهر النص الصريح الذي يدل عليها، والدليل التاريخي الواضح الذي يؤيدها(۱۳) ولعل فيما ذكره ابن الفارض من أن أباه كان يجلس معه في مجالس الحكم ومدارس العلم، مصدر هذا الخطأ الذي وقع فيه السيوطي أو من روي عنه السيوطي قصة ابن الفارض مع الشباب المغني، فظن أنه كان قاضيا والحقيقة أن كل ما هنا هو أنه كان يجلس إلى أبيه فيما كان يجلس من مجالس الحكم وأما ما وقع لابن الفارض مع الشاب المغني وأنه كان سببا في زهده، فذلك إن كان مقبولاً، فإنه ليس وحده كل السبب الذي زهده وحبب إليه طريق الصوفية.''(۱۴)

''وإنما الذي يقبله العقل ويلائم طبيعة النشأة التي نشأها الشاعر والبيئة التي عاش فيها والروح الذي كان مسيطرا على عصره أن تكون نفس ابن الفارض قد تهيأت بحكم هذه كله تهيئة خاصة من شأنها أن تجعلها قابلة للتأثر ما يشير فيها الميل إلى طريق القوم، ويحرك منها الإقبال عليه.''(۱۵)

''ومن هنا يمكن أن يقال إن بذور الزهد والورع والتقوى والعبادة غرست في نفس الشاعر منذ كان يافعا، وظلت كامنة فيها حتى كان ما كان من هذا الشاب المغني معه، فإذا هو يعمل على إحياء هذه البذور وإنماءها وإبرازها في صورة قوية واضحة، وإذا بهذه البذور تأتي كلها في حياة شاعرنا انقطاعا إلى الله وسياحته في وادي المستضعفين حينا وفي أودية مكة حينا أخر، وحباً لله وإعراضا عن كل ما سواه.''(۱۶)

الطور الثاني من حياته

''وقد بدأ هذا الطور عندما حبب إلى الخلاء وفي ذلك يقول ابن العباد الحنبلي" ثم حبب إليه الخلاء وسلوك طريق الصوفية فتنزهد وتجرد وصار يستأذن أباه في السياحة فيسيح في الجبل الثاني من المقطم، ويأوى إلى بعض أودية مرة، وفي بعض المساجد المهجورة في خربات الفراقة مرة ثم يعود إلى والده فيقيم عنده

مدة، ثم يشتاق إلى التجرد ويعود إلى الجبل وهكذا حتى ألف الوحشة فصار لا ينفرد منه ومع ذلك لم يفتح عليه بشيء حتى أخبره البقال أنا إنما يفتح عليه بمكة."(۱۷)

"ظل ابن الفارض على هذه الحال من السياحة في وادي المستضعفين، يقول بها حينا يعود منها حينا آخر، حتى كان يوم حفر فيه من السياحة إلى القاهرة، ودخل المدرسة الصوفية فوجد شيخا بقالا على بابها يتوضأ وضوء غير مرتب فاعترض عليه ابن الفارض بأن هذا الوضوء لا يلائم قواعد الشرع، وهنا نظر الشيخ إلى ابن الفارض وقال له يا عمر أنت ما يفتح عليك في مصر وإنما يفتح عليك بالحجاز في مكة شرفها الله، فاقصدها فقد أن لك وقت الفتح فدهش ابن الفارض من هذا القول، ورد على الشيخ بأن الأمر بينه وبين مكة بعيد وأن لا يجد ركبا ولا رفقة في غير أشهر الحج."(۱۸)

"قال الشيخ وهو يشير ـــ هذه مكة أمامك ـ قالوا فنظر ابن الفارض معه فإذا هو يرى مكة، ثم تركه وطلبها، ولم تبرح أمامه حتى دخلها في ذلك الوقت."(۱۹)

"فإذا لاحظنا ما اشتملت عليه القصة، لاحظنا معه ما قاله ابن الفارض في سياقها من أنه علم أن هذا الرجل من أولياء الله وأنه يستر بالمعيشة ويظهر الجهل بلا ترتيب الوضوء استطعنا أن نستخلص أمرين، أحدهما أنه يمكن أن يعد هذا الشيخ البقال استاذا لابن الفارض وأرشده إلى طريق الفتح، وهداه إلى موطن الكشف والإلهام، وثانيهما أن الشيخ كان واحدا من هؤلاء الصوفية الذين يأخذون أنفسهم بالتستر والاستخفاء وراء مظهر من المظاهر الدنيوية، وأنهم لا يرغبون في أن يعرف الناس حقيقة أمرهم ومكنون سرهم، ويريدون أن يعيشوا على ما بينهم وبين الله من تحبب وتودد، وأن الغرور وحب الظهور لمبعثا بنفوسهم فيظهرون أمام الناس بمظهر جذاب خلاب."(۲۰)

"وبعبارة أخرى يمكن أن يقال إنه كان يتأثر في حياته وسلوكه ومظهره طريق هذه الطائفة من الصوفية التي تعرف باسم الملامية والتي أخص خصائصها أن أفرادها لا يظهرون مما ببواطنهم على ظواهرهم."(۲۱)

الطور الثالث من حياته

"يجري نص شذرات الذهب الذي نقلناه في الطور الأول و الطور الثاني من حياة ابن الفارض و الذي ذكر اشتياقه إلى التجرد و عوده إلى جبل المقطم مرة بعد أخرى حتى ألف الوحشة و مع ذلك لم يفتح عليه بشيء حتى أخبره البقال أن يفتح عليه بمكة فهذا النص يقول بعد ذلك فخرج نوراً في غير أشهر الحج ذاهبا إلى مكة فلم تزل الكعبة أمامه دخلها و انقطع بو اد بينه و بين مكة عشر ليال، فصار يذهب من ذلك الوادي وصحبه أسد عظيم إلى مكة فيصلي بها الصلوات الخمس ويعود إلى محله من يومه و أنشأ غالب نظمه حينئذ و كان الأسد يكلمه و يسأله أن يركب عليه فيأبى و أقام كذلك نحو خمسة عشر عاماً." (۲۲)

"نرى ابن الفارض قد رحل من مصر إلى الحجاز بناء على إشارة الشيخ البقال و كان رحلته هذه بداية الطور الثالث من أطوار حياته و يعد هذا الطور أهم الأطوار جميعاً، لأن الشاعر عاش فيه عيشة خالصة، انقطع فيها إلى السياحة بأودية مكة سياحة كانت سبيله إلى الفتح الإلهي، الأمر الذي يصح معه أن نطلق على هذا اسم (طور الفتح) و إذا كانت المعلومات وصلتنا لم تمكنا من تحديد المدة التي استغرقها كل من الطورين الأول و الثاني تحديدا تاريخياً. إن شأن الطور الثالث مختلف من هذه الناحية ذلك بأنه يمكن أن يحدد التاريخ الذي بيأ فيه و التاريخ الذي انتهى عنده، فكل الذين ترجموا لابن الفارض متفقون اتفاقا أشبه ما يكون بالإجماع على أن وفاته كانت في سنة 632هـ و أنه قضى بالحجاز خمسة عشر عاما، و أنه توطى بمصر بعد عودته من الحجاز بأعوام أربعة، فإن صح هذا كله كان معناه أن الطور الثالث لحياة ابن الفارض بدأ سنة 613هـ و ينتهي 628هـ." (۲۳)

هنالك في أرض الحجاز و في أودية مكة، قضي شاعرنا خمسة عشر عاما سائحا منقطعا عن الناس، لا يكاد يتصل بهم إلى حين كان يأتي إلى الحرم الشريف مطوفا به، مصليا فيه و أنه ليحدثنا شعره عن استيحاشه من الناس و ائتناسه بالوحش فيقول:

وجنبني حبيبك وصل معاشري

وحبني ما عشت قطع عشيرتي
وأبعدني عن أربعي بعد أربع
شبابي وعقلي وارتياحي وصحتي
فلى بعد أوطاني سكون إلى الفلا
وبالوحش أنسى إذ من الإنس وحشتي
وما ظفرت بالود روح مراحة
و لا بالولا نفس صفا العيش ودت

وهنالك في ظل مكة الوارف كان ما تنبأ الشيخ البقال من الفتح على ابن الفارض الذي يثبت هذا بقوله:

يا سميري روِّحْ بمكَّة رُوحي
شادِياً، إنْ رَغِبتَ في إسْعادي
كانَ فيها أُنسِي ومعراجُ قُدسي
وَمَقامي المَقامُ، والفَتحَ بادِ(۲۴)

إن أهمية هذا الطور لا ترجح إلى ما تمتاز به الحياة الصوفية لابن الفارض من الفتح والكشف فحسب، وإنما هي ترجح أيضاً إلى ما نظمه الشاعر فيه من شعر تبدو عليه المسحة البدوية، وتردد في أبياته الصورة الحجازية، على الأثر الذي كان للبيئة سواء في حياته كصوفي وشاعر.

الطور الرابع من حياته

"يقول نص شذرات الذهب بعد ذكره عن إقامة ابن الفارض بمكة المكرمة لخمس عشرة سنة ثم رجع إلى مصر فأقام بقاعة الخطابة بالجامع الأزهر وعكف عليه الأئمة وقصد بالزيارة من الخاص والعام حتى أن الملك كان ينزل لزيارته وسأله أن يعمل له قبرا عند قبره بالقبة التي بناها على ضريح الأمام الشافعي فأبى."(۲۵)

يبدو أن ابن الفارض بعد عودته من الحجاز ووصوله مصر قد أحس اللوعة والحسرة

على ما فات من أيامه مع أحبته في الحجاز، وما أحسه في ظلهم من راحة قلبه وطمانية نفسه وتوالي الكشف والإلهام عليه، واسمع إليه حيث يقول:

يا أهْلَ وِدّي ، هَلْ لراجي وَصْلِكم
طَمَعٌ ، فيَنعَمَ بَالُهُ استِرْواحا؟
مُذْ غِبْتُمُ عنْ ناظِري ليَ أنَّةٌ،
مَلأتْ نواحيَ أرضِ مِصْرَ نُواحا
وإذا ذكَرتُكمُ ، أميلُ ، كأنّني،
مِنْ طيبِ ذِكْرِكمُ ، سُقيتُ الرّاحا
وإذا دُعِيتُ إلى تَنَاسي عَهْدِكُمْ،
ألْفَيتُ أحشائي ، بذاك ، شِحاحا(۲۶)

وحيث يقول:

سقياً لأيّامٍ مَضَتْ مع جيرَةٍ،
كانَتْ لَيَالِينا بهِمْ أفراحا
حيثُ الحِمى وَطني ، وسُكّانُ الغَضا
سَكَني ، ووِردي الماءَ فيهِ مُباحا
وأُهَيْلُهُ أرَبي ، وظِلُّ نخيلِهِ
طَرَبي ، ورَمْلَةُ وادِيَيْهِ مَراحا
واهاً على ذَاك الزّمانِ وطيبِهِ،
أيّامَ كُنتُ ، مِنَ اللُّغوبِ ، مُراحا(۲۷)

تتبين الفرق بين حياة الشاعر في مصر بعد عودته من الحجاز وهي التي يصفها في الأبيات الأربعة الأخيرة. وهذا تغير الأحوال بعد أن عاد من الحجاز إلى مصر، وتقطع الأسباب بينه وبين الفتح وانسداد الكشف عليه أو على حد تغييره هو انقطا ع إرادته وعدم دوامه كما يقول في هذين البيتين فتحدثا عن مكة:

نقلتني عنها الحظوظُ فجذتْ

واردَاتي ولم تُدمْ أورادي

آهِ لَوْ يَسْمَحُ الزّمانُ بعَوْدٍ،

فَعَسَى أنْ تَعُودَ لي أعْيَادي(۲۸)

ويلوح أن الملك الكامل لم يسمع ابن الفارض ولم يعرف شيئا عن أدبه وسلوكه ولم يقدره حق قدره إلى في هذا الطور الأخير من حياته.

سيرته وخلقه

قال ابن خلكان: "وسمعت أنه كان رجلاً صالحا كثير الخير على قدم التجرد جاور بمكة، زادها الله تعالى شرفا وزمانا وكان حسن الصحبة محمود العشرة."(۲۹)

وقال ابن العماد: " وكان جميلاً نبيلاً حسن الهيئة والملبس وحسن الصحبة والعشرة رقيق الطبع عذب المنهل والبلع فصيح العبارة دقيق الإشارة سلس القياد بديع الإصدار والإيراد سخيا جودا أتوجه يوما إلى جامع عمر فلقيه بعض المكاريه فقال اركب معي على الفتوح عربه بعض الأمراء فأعطاه مائة دينار فأعطاه المكاري وكان أيام النيل يتردد إلى المسجد المعروف بالمشتهي في الروضة ويحب مشاهدة البحر مساء فتوجه إلي يوم فسمع قصارا يقصر ويقول:

قطع قلبي هذا المقطع

لا هو يصفو أو يتقطع

"ما قل أي ما كان يصفوا ويتقطع، فصرخ وسقط مغشيا عليه فصار يفيق ويبرد ويضطرب ثم يغمي عليه۔"(۳۰)

"وهكذا كان يواصل أربعينات فاشتهى هريسة فاحضرها ورفع لقمة إلي فيه فانشق الجدار وخرج شاب جميل فقال: أف عليك فقال: إن أكلتها ثم طرحها وأدب نفسه بزيادة عشر ليال۔"(۳۱)

"ورأى المصطفى صلى الله عليه وسلم، في نومه، فقال إلى من تنتسب فقال يا رسول الله إلى بني سعيد قبيلة حليمة، فقال بل نسبك متصل بي يعني نسبة محبة وتبعية۔"(۳۲)

حياة ابن الفارض الروحية

يلاحظ المتأمل في التصوف وفي الحياة الصوفي الذي سلك طريق الصوفية، أن حياته الروحية التي يحياها، ومذهبه الذوقي الذي يذهب إليه، ونوع الحق الذي ينكشف له إنما يتصل بعضه ببعض، ويؤثر بعضه على بعض ويؤدي بعضه إلى بعض لأن هذا كله في الحقيقة أمر صادق يتجلى عن صفحتها ما أخذ به نفسه من معاني العلم وما أخضع له قلبه من مبادي العمل، وما انتهى بعد هذا وذاك من حقائق المشاهدة ودقائق العرفان.

"ذلك بأن التصوف ليس علما من العلوم الدينية أو الشريعة فحسب، ولا عمل من أعمال العبادة التي يتقرب بها الإنسان إلى ربه فحسب، وإنما هو علم وعمل معا، كما أن هذا العلم والعمل ليس أحدهما أو كلاهما إلا وسيلة من الوسائل التي يستعين بها الإنسان على تحقيق غاية أسمى، والتحقيق بنهاية أقصى۔"(۳۳)

وقال ابن خلدون : " وصار علم التصوف في الملة علما مدونا بعد أن كانت طريقة عبادة فقط۔"(۳۴)

إن حياة ابن الفارض وسيرته التي سار إليها ورياضاته ومجاهداته التي اخضع نفسه لها، وأذواقه ومواجيده، ومالها من علاقة بحياته العاطفية، كل أولئك من شأنه أن يظهرنا على أن الرجل قد حقق كل ما ينبغي أن يحققه الإنسان الراقي في حياته الروحانية والخلفية قوامها التجرد عن شوائب الحس، والتحرر من سلطان الشهوة، والإنصراف عن عالم المادة، والإقبال على عالم الروح.

إن ابن الفارض رحمه الله صاحب الذوق الصوفي الحكيم المرهب والوجد الروحي المسرف، وقد أحب الذات الإلهية حبا عميقاً، وتقلب في أطوار هذا الحب حتى بلغ فيه الفناء عن نفسه في محبته مبلغا بعيدا، وعرف من دقائق النفس وحقائق القلب ورقائق الحب أشياء كثيرة لم يجد خيرا من هذا الأسلوب الغزلي الرائع يعبر به عن حبه ويتخذ من هذا التعبير سبيلا إلى إبراز ما كان من أعماق قلبه، حتى بلغ من هذا كله مبلغا جعله ينظر إلى نفسه على أنه إمام الكل من أحب لأنه أعلم بعلم القلب.

إن أذواق الصوفية ومواجيدهم مهما بلغت من القوة والعنف، ومهما انتهت الخاضعين لها إلى الإغراب والشطح، فهي ليست مع ذلك ضربا من أضرب الهذيان، أو لونا من ألوان الاضتراب العصبي أو الاعراض العقلي أو مجرد ألفاظ لا معنى لها ولا غناء فيها، وإنما هي على العكس من هذا كله صور لما احتدم في نفوس أصحابها من عاطفة قوة، ومرآة صادقة، ينعكس على صفحتها ما أخذ به الخاضعون لها أنفسهم من رياضة ومجاهدة، وترجمان عما حال في قلوبهم وكشف لبصائرهم، وانشق في أعماق باطنهم من أنوار الحق والخير والجمال.

○○○

الهوامش

١۔ الزركلي، لخير الدين ،الأعلام، دار العلم للملايين: بيروت، الطبعة الثالثة، ١٣٨٩، ج٥، ص٢١٦

٢۔ بردي، لابن تغري، النجوم الزاهرة، دار الكتب المصرية: القاهرة، ط١٣٧٥، ص٢٨٨

٣۔ ابن خلكان، وفيات الأعيان، منشورات الشريف الرضي، ط/ الثانية، ١٣٠٢ هـ، ج٣، ص٤٥٦

٤۔ وفيات الأعيان، ج٣، ص٤٥٥

٥۔ ابن العماد، شذرات الذهب، دار الفكر: بيروت، ط/١٣٩٩ه، ج٥، ص١٤٩

٦۔ حلمي، لمحمد مصطفى، ابن الفارض والحب الإلهي، دار المعارف: مصر، ص٤٣

٧۔ وفيات الأعيان، ج٣، ص٤٥٥

٨۔ لابن يأس، بدائع الزهور في وقائع الدهور، دار الكتب المصرية، ج١، ص٨١

٩۔ النجوم الزاهرة، ج٣، ص١٢٩

١٠۔ شذرات الذهب، ج٥، ص١٤٩

١١۔ ابن الفارض والحب الإلهي، ص٣١

١٢۔ السيوطي، جلال الدين ،حسن المحاضرة في أخبار مصر والقاهرة، دار الكتب المصرية: القاهرة، ١٣٢٧، ص٤٦

١٣۔ ابن الفارض والحب الإلهي، ص٤٤

١٤۔ نفس المرجع، ص٤٤

١٥۔ البستاني، بطرس، دائرة المعارف، دار المعرفة: بيروت، بدون تاريخ، ص٦٣١

١٦۔ ابن الفارض والحب الإلهي، ص٤٤

١٧۔ شذرات الذهب، ج٥، ص١٤٩

١٨۔ ديوان ابن الفارض، دار الكتب العلمية: بيروت، ص٩

۱۹۔ دیوان ابن الفارض، ص ۹

۲۰۔ ابن الفارض و الحب الإلهي، ص ٤٦

۲۱۔ دائرة المعارف، ج ۱، ص ٦٣٠

۲۲۔ دائرة المعارف، ج ۱، ص ٦٣٠

۲۳۔ ابن الفارض و الحب الإلهي، ص ۵۵

۲۴۔ دیوان ابن الفارض، ص ۹۰

۲۵۔ شذرات الذهب، ج۵، ص ۱۵۰

۲۶۔ دیوان ابن الفارض، ص ۱۰٦

۲۷۔ دیوان ابن الفارض، ص ۱۰۷

۲۸۔ دیوان ابن الفارض، ص ۱۱۳۔۱۱۴

۲۹۔ وفيات الأعيان، ج۳، ص ۴۵۴

۳۰۔ شذرات الذهب، ج۵، ص ۱۵۸

۳۱۔ نفس المرجع

۳۲۔ دائرة المعارف، ج ۱، ص ٦٣١

۳۳۔ حلمي، محمد مصطفى، ابن الفارض سلطان العاشقين، دار المعارف، مصر، ص ۱۵۴

۳۴۔ مقدمة ابن خلدون، منشورات مؤسسة الأعلمي للمطبوعات بيروت لبنان، ص ۴٦۹

○○○

الشيخ محمد عبدالحكيم شرف القادری

الدكتور ممتاز احمد سديدی★

Abstract:

Allama Abdul Hakeem Sharf is a renowned scholar of his time. He gained knowledge of Tafseer, Hadith Spiritualism, Mysticism, Logic, Islamic Jurisprudence, Islamic History and Ilm-ul-Kalam which still in him boyhood. After mastering these subjects he turned him attention to Fiqh, Tasawwuf and Translation Studies. After acquiring rich knowledge he decided to translate the Arabic text books in to Urdu text.He wrote many books on the subjects of Tasawwuf, Fiqh, Hadiths, Uloom-ul-Quran. Allama Abdul Hakeem Sharf Qadri also made him best efforts for the religious, social and political uplift of Muslims in the Islamic World. So, it can be said that Allama Abdul Hakeem Sharf Qadri was responsible for awakening in the Muslim community of Pakistan the desire to regain its moral favor and maintain its purity.

Key Words:

Scholar, Knowledge, Tafseer, Hadith, Spiritualism, Mysticism, Jurisprudence, Fiqah, Tasawwuf, Translation, Arabic, Efforts.

جامعا بين الفقه و التصوف

فی مختلف العصور و الأزمان و شتى البلدان ظهرت و ما زالت تظهر على مسرح الحياة

★ رئیس االقسم العربی، بجامعة المنهاج، بلاهور

شخصيات عظيمة تلعب دورها الإصلاحي و الريادي لرفاهية البشرية جمعاء ثم تختفي وراء أستار الفناء، إلا أن البعض من تلك الشخصيات تظل عالقة بقلوبنا و ماثلة في أذهاننا على الرغم من الرحيل من دنيانا هذه إلى دار الآخرة، فتغيب هذه الشخصيات مثل الشمس من هنا و تطلع هناك، هذا من ناحية و من ناحية أخرى نجد بعض الشخصيات أنها تغرب عن عيوننا و لكنها تبقى في قلوبنا و أذهاننا كأن الله تعالىٰ "جعل لها لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْن۔"(۱)

و من تلك الشخصيات المتمكنة من سويداء القلوب شخصية أستاذ الأجيال، الشيخ محمد عبد الحكيم شرف القادري رحمه الله تعالىٰ رحمة واسعة و أسكنه فسيح جناته، و الذي استطاع أن يجمع بين الفقه و التصوف تارة و بين العلم و الأخلاق تارة أخرى۔ عرفه الناس بعلمه الغزير، و أدبه الجم، و فكره المستنير، و الاعتدال في القول و الكتابة و العمل۔

لقد ولد الشيخ محمد عبد الحكيم شرف القادري رحمه الله تعالىٰ لأبوين تقيين حُرما من ظل أبويهما في صغر السن فاحتضنتهما امرأة صالحة "جنت بی بی" رحمها الله تعالى و التي كانت محرومة عن نعمة الأولاد فسكبت أمومتها وعطفها حنانها على هذين الصغيرين المحرومين من عطف أبويهما في صغر سِنِّهما بقضاء الله و قدره، وعندما وصل كل منهما سِنَّ البلوغ تحت رعايتها جمَعت بينهما بالزواج، فبدأ الزوجان حياتهما في كنف هذه المرأة الرحيمة، و خدماها خير خدمة في كِبَر سِنِّها۔ (۲) لقد رُزِقا ذكورا و إناثا و كان من بينهم شيخنا الشيخ محمد عبد الحكيم شرف القادري رحمه الله تعالى۔

مولده و تسميته

لقد ولد الشيخ محمد عبد الحكيم في الثالث و العشرين من شهر شعبان سنة ۱۳۶۳ هـ الموافق للثالث عشر من شهر أغسطس سنة ۱۹۴۴ م في قرية مرزا بور الواقعة في محافظة هوشيار بور باقليم البنجاب الهندي۔ (۳) وعندما علمت المرأة الصالحة جنت بی بی بمولود للزوجين الذين نشآ و تربيَا في حضنها سُرّتْ سرورا بالغا و سمّته بـ عبد الحكيم (۴) وقد كانت هذه الإمرأة الصالحة للمولود بمنزلة الجدة للأب و الجدة للأم في الوقت نفسه؛ لأنه لم يسعد هذا المولود برؤية جدته للأب و جدته للأم الحقيقتين، و إنما حظى بعطف هذه المرأة الرحيمة

ودعواتها۔

فكان لهذه التسمية تأثير كبير فى عقلية هذا المولود و تفكيره وأعماله وقد رافقه هذا التأثير طوال حياته، والذى فقد كان جامعا بين كل من العبودية لله تعالىٰ والولاء للحبيب المصطفىٰ ﷺ ، كما وجدنا فى شخصيته ظاهرة التواضع لله تبارک تعالى، وهكذا رُزق الشيخ محمد عبد الحكيم شرف القادرى حظا وافرا من الحكمة فى أقواله، وأفعاله وجهوده الإصلاحية۔

نشأتة

نشأ الشيخ محمد عبد الحكيم شرف القادرى فى ظل والده مولانا الله دتا رحمه الله تعالى والذى كان رجلا صالحا ومحبا للعلماء والأولياء والصالحين، كما احتضنته أم تقية صالحة، وهى رابعة عصرها "رابعه بی بی" رحمها الله تعالى وقد كانت نشأته متصفة بالصلاح، والتقوى، ونور العلم۔

ويحدثنا الشيخ محمد عبد الحكيم شرف القادرى عن والده مولانا الله دتا بقوله:

> "حُرم فضليته من ظل والديه فى صغره سنّه، فكلفَّلته امرأة من أسرة متصفة بالعلم والدين، وكان مشغوفا بالعبادة لدرجة أنه كان يذهب أحيانا إلى المسجد فى منتصف الليل فيقضى بقية ليله فى تلاوة القرآن والصلاة على الحبيب المصطفى ﷺ، وكان يبدو من تحرُّک شفتيه باستمرار أنه يردِّد وِردا من الأورادبصوت خافض۔"(۵)

هذا وقد أفادنا الشيخ محمد عبد الحكيم شرف القادرى بمعلومات قيمة عن والدته الكريمة قائلا:

> "كانت آية فى الصبر، والرضى، والحياء، و تقوى الله عزوجل، فكانت تتمسک بالصبر و تبتعد عن الجزع والفزع كل الابتعادحتى فى أصعب الأحوال، وكانت ملتزمة بالصلوات الخمس، بالإضافه إلى شغفها البالغ بالقرآن الكريم، فكانت تجتهد فى تلاوة القرآن فى شهر نزوله حتى أنها كانت تتلوه بحب شديد حوالى عشرين مرة، ولم يكن سائل يعود من بابها خاوى

الوفاض، ولقد استمعتُ إليها [والكلام للشيخ محمد عبدالحكيم شرف القادری] أنها تُردّد اسم الجلالة "الله" بوضوح شديد وعندما لم تتمكن من ذكر الله بلسانها أخذت تذكر ربّها بأنفاسها عند نهاية مطاف حياتها۔"(٦)

"وهكذا كانت آخر لحظاتها معطرة بذكر الله تعالىٰ بترديد اسم الجلالة، لم لا فقد قضت حياتها ذاكرة ربَّها أطراف الليل وآناء النهار، وقد رآها حفيدها (كاتب السطور) فی طفولته أنها كانت ملتزمة بالأوراد والأذكار المعينة، كما أنها كانت تتلو القرآن الكريم بمواظبة واستمرار عند شروق كل يوم جديد، وكانت هذه التلاوة تبلغ قمتها فی شهر رمضان المبارک كما ذُكر آنفا هذا شغفها بالقرآن فی أيام صحتها، ومن غريب الأمر أنها لم تأذن مرض الفالج أن يحول بينها وبين تلاوتها للقرآن الكريم وأداء الصلوات الخمس، فكانت لا تستطيع أن تجلس كثيرا علی سريرها، إلا أنها بعزيمتها القاهرة استطاعت أن تواصل مسيرتها الروحية وعلاقتها بالقرآن الكريم۔"(٧)

"ومن هنا نعلم أن الشيخ محمد عبد الحكيم شرف القادری كان محظوظا بأبويه فقد كان كل منهما بمثابة المدرسة التربوية الأولی حيث تعلم الولد السعيد وتلقّی الدروس الأولی فی حياته، تلک الدروس التی كانت بمنزلة اللبِنات الأولی فی بناء صرح شخصيته القويمة المتزنة، وإلی هذا الأمر أشار الشيخ تاج محمد خان الأزهری بعد ذكر مولد شيخنا الشيخ محمد عبدالحكيم شرف القادری بقوله: "فنشأ وترعرع فی أسرة متمسكة بالدين۔"(٨)

وأخبرنا الأستاذ اقبال أحمد الفاروقی رحمه الله تعالیٰ عن حب العلم المتمكن من سويداء قلب الوالد لشيخنا قائلا:

"كان والده مولانا الله دتا يحضر مجالس العلماء فوهب ابنه هذا للدراسات الدينية۔"(٩)

ويخبرنا الشيخ محمد منشا تابش القصوری عن التربية الإسلامية التی تلقاها الشيخ محمد عبدالحكيم شرف القادری عن والده، فيقول:

"لقد كان والده ملتزما بالصلوات والصيام للغاية، والذی فی ظل تربيته الخاصة والأدعية المستجابة نشأ وترعرع الشيخ محمد عبد الحكيم شرف

القادری۔"(۱۰)

إقباله على العلم و بداية الدراسة

وُلد الشيخ محمد عبد الحكيم شرف القادری فی بيت أشرب حب العلم و الدين، فقرأ القرآن -علی حد علم الباحث- علی يد والدته رابعة بی بی و التی كان يحضرها أولاد حارَتها الصغار لقراءة القرآن، وقد قرأ الباحث هو الآخر بعض الأجزاء علی يد جدته هذه۔ أما الدراسة النظامية فی المدرسة الحكومية فقد بدأها الشيخ محمد عبد الحكيم شرف القادری فی السابعة من عمره سنة ۱۹۵۱ء فی مدرسة ايم سی الابتدائيه بحیّ انجن شيد بلاهور وظل يدرس بها حتی سنة ۱۹۵۵م۔ إلا أنه لم يواصل دراسته علی هذا النهج و المنوال بل رغب فی الدراسات الدينيه المحتوية علی دراسة العلوم الإسلامية و العربية، فسافر لتحقيق بغيته هذه من مدينةٍ إلی أخری، وكانت بداية رحلته العلمية بالسفر إلی فيصل آباد حيث درس فی الجامعة الرضويه لمدة سنتين أی من ۱۹۵۵م إلی ۱۹۵۷م ثم عاد إلی مسقط رأسه مدينة لاهور حيث درس فی الجامعة النظامية لمدة أربع سنوات أی من ۱۹۵۸م إلی ۱۹۶۱م وأكمل دراسته فی الجامعه الإمدادية المظهرية بقرية بنديال۔ (۱۱) وهكذا أكمل الشيخ دراسته بكامل الشغف والجِدِّية والاهتمام۔

أساتذته

لقد درس الشيخ محمد عبد الحكيم شرف القادری علی يد الأساتذة الأجلاء فی عصره حتی تمكن من العلوم الإسلامية و العربية تمكنا أقرّ عيون أساتذته، تحدث عن علمه وأعماله الأدبية فضيلة الشيخ الأستاذ المفتی منيب الرحمن قائلا:

"لقد قام فضيلته باكتساب العلم و الفيض من أساتذة عصره الأجلاء ثم بذل حياته كلها تقريبا فی التدريس و التحقيق و التصنيف۔"(۱۲)

شيوخه فی الحديث

لقد كان الشيخ محمد عبد الحكيم شرف القادری مولعا بالقرآن الكريم و الحديث النبوی الشريف، فلم يتمكن من السفر إلی البلاد العربية أيام دراستة ليقرأ القرآن الكريم علی

الشيوخ العرب ويأخذ منهم علوم القرآن الكريم والحديث النبوى الشريف، فحقق أمنيته هذه عن طريق الإجازات العلمية التى حصل عليها من العلماء العرب تارة ومن العلماء الباكستانيين والهنديين تارة أخرى۔ لقد ذكر الشيخ محمد عبد الحكيم شرف القادرى ثمانية وعشرين شيخا من شيوخه العرب فى ثبته الموجز "الجواهر الغالية من الأسانيد العالية۔" أذكر بعضا منهم على سبيل المثال: محدث الحرمين الشريفين السيد الشريف العلامة الدكتور محمد علوى المالكى رحمه الله رحمة واسعة وأسكنه فسيح جناته، والشيخ المعمر العلامة فضل الرحمن المدنى رحمه الله تعالى، ومفتى الديار المصرية الأستاذ الدكتور على جمعه، ورئيس جامعة الأزهر الأسبق الأستاذ الدكتور أحمد عمر هاشم، والشيخ محمد إبراهيم عبد الباعث الحسنى الكتانى المصرى، والعلامة المفتى عبد الكريم (المدرس بالحضرة القادرية سابقا) والشيخ أحمد محمد الحافظ عبد اللطيف التيجانى، والشيخ محمد هاشم السيوطى الحنفى، والشيخ أحمد نصيب المحاميد الشامى، والمهاجر المدنى الشيخ محمد على مراد الشامى، والأستاذ الدكتور سعد سعد جاويش، والعلامة أحمد بن محمد سردار الحلبى الشافعى، ومفتى قطنا الأسبق الشيخ السيد إبراهيم الغلايينى الدمشقى، والداعية الإسلامى الكبير العلامة السيد يوسف السيد هاشم الرفاعى، والشيخ السيد يوسف بن السيد محى الدين البخور الحسنى، والشيخ صلاح الدين التيجانى ، وشيخ الإسلام إبراهيم صالح الحسينى النائجيرى، والشيخ عبد الغفور (المدرس بجامع الإمام الأعظم ببغداد سابقا) والشيخ أسامه بن السيد بن محمود الشافعى المصرى، والشيخ محمد اليعقوبى الشامى۔[۱۳]

قيامه بمهمة التدريس

عندما اكتملتْ مرحلة أخذ العلم واكتسابه من الأساتذه الأجلاء بدأت مرحلة العطاء فبدأ شيخنا هذا مهمة التدريس من الجامعة النعيمية بلاهور سنة ۱۳۸۴ھ/۱۹۶۵م[۱۴] فظل يوزع نور العلم فى تلاميذه، وانتقل إلى بعض المدن الأخرى لإنارة القلوب والعقول حيث ظل يعدُّ الكوادرَ العلمية، وفى سبتمبر عام ۲۰۰۲م انقطع عن التدريس فى الجامعة النظامية بلاهور[۱۵] وكان ذالک نظرا للظروف الصحية ولولا ظروفه هذه لما انقطع عن مهمة إنارة

المصابيح العلمية۔

تلاميذه

تتلمذ مئات الطلاب على يد الشيخ محمد عبد الحكيم شرف القادری وأخذ وا منه العلوم الإسلامية والعربية فی مختلف المدن، وبالتالی انتشروا فی أنحاء باكستان و أرجاء العالم لنشر التعاليم الإسلامية المحتوية على السماحة۔ [۱۶] وعن تلاميذ الشيخ محمد عبد الحكيم شرف القادری أخبرنا الشيخ المفتی منيب الرحمن قائلا:

" مئات تلاميذه موجودون فی أرجاء العالم حيث يقومون بالخدمات الدينية۔ "[۱۷]

أخذُهُ الطَّريقةَ

تنبَه الشيخ محمد عبد الحكيم شرف القادری خلال قيامه بمهمة تدريس العلوم العربية والإسلامية إلى أنه لم يبايع أحدا من المشايخ، فأقبل يفكر فی هذا الموضوع حتى وقعت نظرة الانتخاب على واحد من سلالة أهل البيت، والذی كان ممن جمعوا بين العلم والعمل والأخلاق، إنه السيد الشريف أبو البركات السيد أحمد القادری رحمه الله تعالىٰ، فأتاه الشيخ محمد عبد الحكيم شرف القادری رحمه الله تعالىٰ وطلب منه المبايعة فی السادس عشر من شهر محرم سنة ۱۳۹۵ هـ الموافق للخامس والعشرين من شهر مارس سنة ۱۹۷۵ م، إلا أنه ردَّ على هذا المفهوم بقوله: "تعال بعد بُكرة۔" وكان هذا الرد على نهج المشايخ القدماء على سبيل الاختبار حتى يظهر أن الطلب صادق أم لا؟ فطلب منه شيخنا بشغف واشتياق بالغَين المبايعة قائلا:

" سيدی إذا جاءک كافر بقصد اعتناق الإسلام فهل تقول له: "تعال بعد بكرة؟" فقال فضيلة الشيخ: "لا حول ولا قوة إلا بالله العلی العظيم، ما معنى هذا الكلام؟" فقال المتعطش إلى المبايعة فی أدب واحترام واشتياق: "سيدی! أريد التوبة على يدک الكريمة وحضرتک تقول: "تعال بعد بُكرة۔" فقال السيد الشريف نظرا إلى شوق هذه المتعطش إلى المبايعة: "هات يدک" ثم بايعه فی الطريقة القادرية۔ "[۱۸]

قيامه بالتصنيف والتأليف والترجمة۔

لقد كان الشيخ محمد عبد الحكيم شرف القادری رحمه الله تعالىٰ مدرسا للعلوم العربية والإسلامية عموما وعلوم الحديث النبوی الشريف خصوصا، وكان فضيلته يدرِّس شتى المواد خمس ساعات متواليات على نهج العلماء المسلمين فی كل من باكستان وبنجلاديش والهند، ومن المعلوم أن الاستعداد للتدريس يأخذ وقتا، فالعلماء المدرسون عموما لايقدرون على التصنيف والتأليف نظرا للاشتغال الشديد بالتعليم، إلا أن الشيخ محمد عبد الحكيم شرف القادری استطاع أن يحضِّر دروسه و يصنف، ويؤلف، ويترجم الكتب من العربية والفارسية إلى الأردية، وعن جهوده العلمية حدثنا الدكتور حافظ محمد منير الأزهری بقوله:

"له مؤلفات قيمة فی شتى الموضوعات الدينية، كما أنه قام بترجمة العديد من الكتب العربية والفارسية إلى الأردية۔"(۱۹)

هذا وقد أدلى العميد الأسبق لكلية الآداب بجامعة على كره، الأستاذ الدكتور مختار الدين أحمد -رحمه الله تعالى- برأيه فيما كتبه الشيخ محمد عبد الحكيم شرف القادری فی تراجم العلماء الباكستانيين فی رسالة كتبه الدكتور فی الثالث من شهر مارس سنة ۱۹۹۳م وقال:

"لقد كانت سعادتی بالغة بتأليفكم "تذكره أكابر اهل سنت" [أی تراجم العلماء الأكابر من أهل السنة] لقد رتبتَ تراجم ثمانية وسبعين ومئة من العلماء الباكستانيين، واللذين كان الباحثون الهنديون يتصفحون مئات المجلات والجرائد فلايجدون شيئا عن أحوالهم ومصنفاتهم، أسأل الله أن يؤديک الصحة والعافية حتى تستطيع أن ترتب المجلد الثانی من هذا الكتاب۔"(۲۰)

وعند ما اطلع الدكتور مختار الدين أحمد على الكتابة العربية للشيخ محمد عبد الحكيم شرف القادری أظهر سروره واستحسانه فی رسالة أخرى أرسلها إلى الشيخ محمد عبد الحكيم شرف القادری فی التاسع من شهر نوفيمبر سنة ۱۹۹۲م وقال:

"لم اطلع على الكتابات العربية لحضرتک قبل الآن، إنها مكتوبة بلغة جيدة جدا۔۔۔وقد اطلعت على الترجمة الأردية لأشعة اللمعات (المجلد الرابع)۔۔۔

فهذه ترجمة سهلة و سلسة، و من خلال هذه ترجمة يستطيع كل ذی علم بسيط أن يدرک مفهوم الحديث، و أصبح الآن فهم هذا الكتاب ممكنا دون الاحتياج إلى الأستاذ، وقد اطلعت على التعليقات بين القوسين والتی كانت مهمة جدا۔"(۲۱)

تعريف بالبعض من مؤلفاته بشیء من التفصيل

للشيخ محمد عبد الحكيم شرف القادری باللغة العربية والفارسية والأردية كتب قيمة بالإضافة إلى الترجمات من العربية والفارسية إلى الأردية والحواشی على الكتب، ويتراوح عدد كتاباته بين الصغير والكبير من مائة ولا يتسع المجال لذكرها۔(۲۲) وفی هذا المقام أحاول أن أقوم بتعريف البعض من الكتب التی ترجمها الشيخ محمد عبد الحكيم شرف القادری على سبيل المثالی لا الحصر۔

أنوار الفرقان فی ترجمة معانی القرآن

تحمل ترجمة الشيخ محمد عبد الحكيم شرف القادری لمعانی القرآن الكريم مكانة مرموقة بين جهوده العلمية، لقد قام العديد من العلماء بكل من باكستان والهند بترجمة معانی القرآن الكريم إلى اللغة الأردية قبل الشيخ محمد عبد الحكيم شرف القادری، وإنه بفضل الله تعالى أولا و نظرا لشغفه بالقرآن الكريم ثانيا سعد وتشرف هو الآخر بهذه المهمة المباركة، فوهبه الله تبارک وتعالى إرادة قوية فأقبل بشغف ونهم بالغَين على ترجمة معانی القرآن الكريم فأكمله بفضل الله تعالىٰ وتوفيقه، وبعد ذالک بخمسة شهور فاضت روحه الطاهرة إلى بارئها سعيدةً ومطمنةً على هذه النعمة العظمى۔

لقد كان حُلم ترجمة معانی القرآن الكريم يراود قلبه منذ زمان إلا أنه كان علم بحساسية الأمر وخطورة المسئولية فی الآيات المتشابهات خاصة وغيرها من الآيات عامة، فلم يبدأ الترجمة لمدة طويلة، إلا أنه بدأ الترجمة ولكنه لم يستطع مواصلة السير نظر الحساسية المهمة وظروفه، وإنه عندما أجريت عملية جراحية على لسانه (فی ۲۰۰۴/۰۴/۱۳م)(۲۳) وانقطع عن التدريس نهائيا لعدم تمكنه من القيام بالمسئولية فالتفت إلى تكميل ترجمة معانی القرآن

التی کان قد بدأها سائلا ربَّه التوفیق و النجاح فی الثلاثین من شهر جمادی الآخرہ سنة ۱۴۱۹ هـ الموافق للاثنین و العشرین من شهر أکتوبر ۱۹۹۸ م وأخذ یمضی قُدُما بتوفیق الله عز و جل، و کان آیة فی الصبر، و الاستسلام لقضاء الله و قدره، فلم یفزع من مرض سرطان بل أقبل علی الترجمه بهمة و نشاط، و کانت سرعة عمله فی أیام مرضه أکثر مما کانت علیه فی أیام صحته، وأکمل بتوفیق الله تعالیٰ و کرمه الترجمة فی ۲۴ من شهر محرم ۱۴۲۸ هـ الموافق ۱۳ من شهر فبرایر ۲۰۰۴م۔(۲۴)

”وبالنظر فی هذه الترجمة یبدو أنه أفاد الشیخ محمد عبد الحکیم شرف القادری من تفسیر القرطبی، والتفسیر الکبیر، وروح المعانی، وتفسیر الجلالین، وتفسیر السمرقندی، والمقتطف من التفاسیر، وتفسیر: التحریر والتنویر، وتأویلات أهل السنة، ومدارک التنزیل، وتفسیر البیضاوی، وتفسیر المظهری، ومفردات القرآن للأصفهانی، ومن هنا کانت ترجمته لمعانی القرآن الکریم ترجمة تفسیریة، و کان الشیخ فی بعض الأحیان یسیر فی ترجمته هذه علی منهج تفسیر القرآن بالقرآن، أو بالحدیث النبوی الشریف، أو باقوال المفسرین، إذ أن ترجمة معانی القرآن الکریم نوع من التفسیر عند أساتذة علوم القرآن من العرب۔ وإنه ینبه فی کثیر من المواضع علی المصدر الذی استعان به فی الترجمة۔ “(۲۵)

لقد مرت هذه الترجمة بمراحل کثیرة من مراجعة الأخطاء المطبعیة، و حصل تأخیر فی طباعته، إلا أنه طبع فی شهر ینایر ۲۰۱۵م(۲۶) والحمد لله و الشکر له۔

وقال المفتی الدکتور غلام سرور القادری رحمه الله تعالیٰ معرفا بأنوار الفرقان:

” لقد أنهی الشیخ محمد عبد الحکیم شرف القادری ترجمة لمعانی القرآن الکریم فی أواخر أیام حیاته والذی یستأهل کل خیر من الناحیة العلمیة والتحقیقیة وسوف یستفید بها المسلمون، جزاه الله عن هذا العمل خیر الجزاء۔“(۲۷)

وقال الدکتور عبد القدیر خان عن هذه الترجمة لمعانی القرآن الکریم:

” إن ترجمته الأردیة لمعانی القرآن الکریم هدیة قیمة إلی جمیع المُلِمّین

بالأردية في العالَم۔"(۲۸)

ترجمة كتب التصوف إلى الأردية

لقد قام الشيخ محمد عبد الحكيم شرف القادرى بترجمة بعض كتب التصوف المهمة ليطلع الناس على التصوف الذى يأخذ بيد الإنسانية إلى برِّ الأمان، ذلك التصوف الذى نوَّر أرجاء الهند المترامية الأطراف على الرغم من تواجد الحكومات الهندوسية۔ وفيما يلى تفصيل ذالك۔

(ا) تحصيل التعرف فى معرفة الفقه و التصوف، للشيخ عبد الحق الدهلوى۔

يبدو أن الشيخ عبدالحق المحدث الدهلوى رحمه الله تعالىٰ أرد أن يبين للفقيه أهمية التصوف وأن يبين للمتصوف أهمية الفقه، لأن حرمان الفقيه عن التصوف يسبب الخسارة فى العمل وحرمان المتصوف عن الفقه يؤدى الى خسارة فى العقيدة بسبب الوساوس الشيطانية التى لا يتخلص منها الا ذو علم بالشريعة الغراء، عن وقد سمى كتابه هذا: "تحصيل التعرف فى معرفة الفقه والتصوف وأحوال الصوفية والفقهاء۔" وإنه قسَّم كتابه هذا إلى قسمين، فالقسم الأول يحتوى على شرح ثمانية وعشرين قاعدة أوردها الشيخ أحمد زروق فى كتابه: "قواعد الطريقة فى الجمع بين الشريعة والطريقة۔" أما القسم الثانى فيشتمل على بيان الفقه والفقهاء وأحوال الأئمة الأربعة وما يتعلق به۔"(۲۹) والجدير بالذكر أنه كان الشيخ محمد عبد الحكيم رحمه الله تعالىٰ هو الآخر ميَّالا إلى الجمع بين الشريعة والطريقة حتى يتحقق المراد وهو العثور على رضى الرحمن جل جلاله۔

(ب) دلائل الخيرات وشوارق الأنوار، للشيخ محمد بن سليمان الجزولى

وهى مجموعة من صيغ الصلاة على الحبيب المصطفىٰ ﷺ يتلوها المحبون المشتاقون إلى الحبيب المصطفىٰ ﷺ فى مشارق الأرض ومغاربها، وقد رأيت بعض المصريين يقرأونها جماعة جهرا بصوت واحد۔ وأخبرنى الشيخ بدر الإسلام الصديقى أنه رأى أهل مُرَّاكش يقرؤن دلائل الخيرات جهرا بصوت واحد عند ضريح الشيخ محمد بن سليمان الجزولى فى مقابر رياض العروس بمُرَّاكش۔(۳۰)

(ح) مطالع المسرات شرح دلائل الخيرات، للعلامه مهدى الفاسى

لم يكن هذا الشرح متداولا بترجمته الأردية فى الأوساط الصوفية بباكستان أو الهند فترجمه الشيخ محمد عبد الحكيم شرف القادرى بالأردية حتى يفهم الناس معانى الصلوات على النبى ﷺ فتزداد لهم حلاوة القراءة۔

(ج) مجموعه وظائف[31]

تشمل هذه المجموعة من الأوراد على كل من: صيغة الصلاة المعروفة بـ صلاة تنجينا، ودعاء يُقرأ كل يوم، والشجرات الصوفية، والأوراد الفتحية للسيد على الهمدانى، وحزب البر وغير ذالک من الأوراد، وكان الشيخ محمد عبد الحكيم شرف القادرى قد رتب هذا الكتاب وراجعه مراجعة دقيقة قبل رحيله إلى دار الآخرة بشهور معدودة، وكان ملتزما بالأوراد الفتحية نظرا لاحتوائها على كلمات الحمد لله تعالى وتسبيحه وتقديسه، كما أنه كان يقرأ باهتمام شديد الدعاء الذى نقله من التمهيد لأبى شكور السالمى رحمه الله تعالىٰ، وهو كما يلى: "بسم الله الرحمن الرحيم، اللهم إنى أعوذ بک من أن أشرک بک شيئا وأنا أعلم به، وأستغفرک لما لا أعلم به، تبرأت من الكفر والشرک والمعاصى كلها، وأقول لا اله الله محمد رسول الله صلى الله تعالىٰ عليه وآله وصحبه وبارک وسلم۔"[32]

(د) الحزب الأعظم، للعلامة على القارى

ترجم الشيخ محمد عبد الحكيم رحمه الله تعالىٰ هذه المجموعة من الأدعية والصلاة على النبى ﷺ وكلمات الحمد لله تعالىٰ، وينقسم هذا الحزب إلى سبعة أقسام لكل يومٍ حزب معينٌ، وهذه الترجمة غير مطبوعة حتى اليوم۔

(هـ) بردة المديح للشيخ محمد بن سعيد البوصيرى

لقيتْ هذه الميمية قبولا ورواجا فى العالم العربى والإسلامى، ولقد رأيت خلال إقامتى فى مصر أن الصوفية يهتمون بها اهتماما بالغا، بل تؤخذ إجازة قراءته والمشايخ يجيزون، كما وجدت أن سكان كل بلد عربى يقرؤنها بلحنهم الخاص، وقد لاحظت أن المصريين يقرؤنه كاملا وجماعةً بصوتٍ واحدٍ فى مسجد الشيخ محمد بن سعيد البوصيرى رحمه الله تعالىٰ بالإسكندرية بعد صلاة الجمعة، وقد حضرتُ مسجده مع الشيخ محمد عبد الحكيم شرف

القادری رحمه الله تعالیٰ والسید وجاهت رسول القادری حفظه الله تعالیٰ فی شهر سبتمبر ۱۹۹۹م وقد لاحظنا المصریین أنهم یقرؤن کل فصل بلحن جدید فهی سبعة ألحان یختلف کل منها عن الآخر، والمصریون یحتفلون بمولده کل سنة۔(۳۳)

براعته فی اللغة فی العربیة وآدابها

اهتم الشیخ محمد عبد الحکیم شرف القادری اهتماما بالغا باللغة العربیة لکونها لغة القرآن الکریم، ولغة الحبیب مصطفیٰ ﷺ ولغة المصادر الأساسیة للعلوم الإسلامیة والعربیة، یحدثنا الدکتور فضل حنان عن براعة الشیخ فی اللغات الثلاثة قائلا:"کان العلامة محمد عبد الحکیم شرف القادری رحمه الله تعالیٰ أستاذا لانکاد نجد له مثیلا فی عصرنا الراهن، فقد کان متمکنا من اللغة العربیة نطقا وکتابة، کما کان فضیلته قد صنف وألف باللغات الثلاثة۔(۳۴)

وقال عنه المفتی منیب الرحمن:

"لقد ترک فضیلة الشیخ وراءه تراثا علمیا ذات قیمه بالأردیة والعربیة۔"(۳۵)

"لقد کان الشیخ محمد عبد الحکیم شرف القادری شدید الاهتمام بالکتاب والسنة، وإنی کنتُ سألته عن موضوع نحوی لرسالة الماجستیر فی اللغة العربیة وذالک عندما أنهیت المرحلة الدراسیة فی الجامعة الإسلامیة العالمیة بإسلام آباد فقلت له: إننی أرید أن أحضِر الرسالة العلمیة فی النحو۔" فردَّ علیَّ قائلا: " اختر موضوعا نحویا ذا صلة بالقرآن الکریم أو بالحدیث النبوی الشریف، فإن کلا من الصرف والنحو والأدب والبلاغة وغیرها من العلوم وسیلة لفهم القرآن والحدیث، فلن یُسعدنی أن تردِّد أسماء النحو یین طوال عمرک فتظل تقول: "قال سیویه کذا، وقال أخفش کذا۔" بل أرید أن أسمع منک: قال الله تعالیٰ کذا، وقال الرسول ﷺ کذا۔ عندئذ أعددتُ بحثا تحت عنوان:"أسالیب القسم فی القرآن الکریم دراسة نحویة۔"(۳۶)

"لقد تشرفت بالدراسة فی رحاب الأزهر المعمور من عام ۱۹۹۶م إلی ۲۰۰۴م وعندما کنت علی أهبة الاستعداد لتسجیل الموضوع فی مرحلة

التخصص "الماجستير" استشرت أستاذى الكريم الشيخ محمد عبد الحكيم شرف القادرى عن موضوع مناسب للرسالة فى الأدب والنقد، فقال لى: "إن الحياة نعمة عظيمة فلا تضيّعها فى: قال امرؤ القيس، وقال عمر بن ربيعة، وقال المتنبى۔ إذ أنه ليس الأدب العربى إلا وسيلة للوصول إلى معانى القرآن الكريم والحديث النبوى الشريف فلا تجعلنَ المصباح المنوِّر للطريق منزلا وهدفا لک۔"(۳۷)

قيامه بنظم الشعر العربى

لقد كان الشيخ محمد عبد الحكيم شرف القادرى رحمه الله تعالىٰ على دراية بعلم النحو والصرف، والبلاغة، والأدب، وذالک بجانب براعته فى التفسير، والحديث، الفقه، والمنطق، والفلسفة۔ وكنت قد درستُ عليه ديوان الحماسة، فكان لا يقبل الخطأ لا فى الإعراب ولا فى الوزن الشعرى، أى أنه كان على علم بالبحور الشعرية والتقطيع أيضا، وكانت عشرات الأبيات الأردية، والفارسية والعربية مخزونة فى ذاكرته، الأمر الذى يدل على ذوقه الأدبى، فقد نظم شعرا بالعربية والفارسية والأردية، وإن شعره القليل يدل على ما كان لديه من مكنة شعرية، إلا أنه لم يتفرغ لقريض الشعر، كما أنه لم ينظم غير الشعر الدينى شيئا، وليس لدينا متسع لذكر النماذج من شعره الأردىّ والفارسى(۳۸) لذا نكتفى بإيراد شعره العربى فقط، لقد نظم الشيخ محمد عبد الحكيم شرف القادرى قصيدة على نهج لامية البوصيرى وجمع فيها بين المناجاة ومدح الحبيب المصطفىٰ صلى الله عليه وآله وسلم، إنه يقول:

يَارَبِّ بِالْمُصْطَفىٰ طَهِّرْ بـوَاطِنَـنَا ۔۔۔ عَنِ الرَّزَائِلِ وَاحْفَظْهَا مِنَ الَّلَمَمِ
يَارَبِّ بِالْمُجْتَـبَى نَوِّرْ لَطَائِـفَنَا ۔۔۔ بِالذِّكْرِ وَالْفِكْرِ وَالْعِرْفَانِ وَالْحِكَمِ
مُحَمَّدٌ سَيِّدُ السَّادَاتِ فِىْ كَرَمٍ ۔۔۔ مُعَلِّمُ النَّاسِ بِالتَّوْحِيْدِ وَالْعِظَمِ
وَالْمُسْلِمُوْنَ عـلَوْا فِىْ كُلِّ مَعْرِكَةٍ ۔۔۔ بُالرُّشْدِ وَالْخَيْرِ وَ الإيْمَانِ ذِىْ الْقِيَمِ
لَمَّا عَصَوْا أَمْرَهُ جَـهْلاً بِرِفْعَتِهِ ۔۔۔ صَارُوْا ذَوِى الذُّلِّ وَالْخُسْرَانِ فِى الْأُمَمِ
صَارُوْا عـبِـيْدَ كَلِنْتُنْ مُخْلِصُوْنَ لَهُ ۔۔۔ وَأَصْبَحُوْا لُعْبَةً لِّلْعَانِدِ الْخَصِمِ
أَمَا تَرىٰ مُسْلِمِىْ شِيْشَانَ فِىْ كَرَبٍ ۔۔۔ وَبُوْسَنَا أَهْلُهَا فِى الضَّيْمِ وَالضَّرَمِ

وَمَا تَرىٰ مُؤمِنِیْ کَشْمِیْرَ فِیْ حَنَقٍ وَفِی الْمَصَائِبِ وَالعُدْوَانِ وَالنِّقَم(۳۹)

هذا وقد نظم الشيخ رباعيتين باللغة العربية على نهج رباعية شهيرة للشيخ سعدى الشيرازى، فقال هائمافى حب الحبيب المصطفىﷺ:

بَهَرَ الْحِسَانَ جَمَالُهٗ غَلَبَ الْجَمِیْعَ کَمَالُهٗ

بَلَغَ الْاَنَامَ نَوَالُه فَمِنَ الْمُحَالِ مِثَالُهٗ(۴۰)

والرباعية الثانية كمايلى:

نَشَرَ الْهُدیٰ بِمَقَالِهٖ غَمَرَ الْوَریٰ بِنَوَالِهٖ

قَهَرَ الْعِدیٰ بِجَلَالِهٖ صَلُّوا عَلَیْهِ وَآلِهٖ(۴۱)

اشتغاله بتدريس الحديث الشريف

تشرف الشيخ محمد عبد الحكيم شرف القادرى بتدريس العلوم الإسلامية فترة طويلة ذكرنا ها آنفا، وقد قام بتدريس مختلف المواد الإسلامية والعربية، إلا أنه سعد و تشرف بتدريس الحديث النبوى الشريف قرابة ثلاثين سنة، وقد قام بتدريس مشكاة المصابيح، وسُنن أبى داؤد، وسنن ابن ماجة، وصحيح البخارى، يقول الشيخ محمد عبد الحكيم شرف القادرى متحدثا بنعمة الله :" لقد رجعت فى شهر شوال سنة ۱۳۹۳ هـ الموافق للعام ۱۹۷۳ م إلى الجامعة النظامية بلاهور حيث عُينتُ رئيسا للمدرسين وبالتالى تشرفت بتدريس أبى داؤد۔ وبعد خمس سنوات سعدتُ بتدريس صحيح مسلم سنة ۱۹۷۸ م ثم بعد ذالک وفقنى الله تعالى لتدريس صحيح البخارى سنة ۱۹۸۳ م، اضافة إلى أننى تشرفت بتدريس ابن ماجة و الموطأ للإمام محمد، وما زال تدريس الحديث النبوى الشريف مستمرا حتى الآن (أى إلى العام ۱۹۹۷ م)۔(۴۲) ولقد تشرف كاتب السطور بدراسة ابن ماجه والبخارى على يد فضيلة الشيخ رحمه الله تعالىٰ سنة ۱۹۸۷ م۔

وكان فضيلته قد بدأ شرح البخارى بهدف إكمال فيوض البارى شرح صحيح البخارى للعلامة الشيخ محمود أحمد الرضوى رحمه الله تعالى، والذى لم يستطع أن يكمل شرحه، وبعد أن شرح الجز الخامس عشر وافته المنية، فلبى نداء ربه وفاضت روحه الطاهره إلى بارئها، فأراد

الشیخ محمد عبد الحکیم شرف القادری أن یکمل هذا الشرح، إلا أنه کان یرغب فی ترجمة معانی القرآن الکریم، فلم یستطع أن یشرح غیر الجزء السادس عشر من فیوض الباری شرح صحیح البخاری للعلامة الشیخ محمود أحمد الرضوی رحمه الله تعالی۔

هذا وقد قام الشیخ محمد عبد الحکیم شرف القادری بترجمة المجلد الرابع والخامس والسادس لأشعة اللمعات بشرح المشکوة للشیخ عبد الحق المحدث الدهلوی رحمه الله تعالیٰ، وقد کان الشیخ محمد سعید النقشبندی رحمه الله تعالی قد ترجم المجلدات الأولی من شرح المشکوة إلی الأردیة، وبعد رحلیه إلی دار البقاء أکمل الشیخ محمد عبد الحکیم شرف القادری ترجمة بقیة المجلدات من الفارسیة إلی الأردیة بمساعدة الشیخ المفتی محمد خان القادری حفظه الله تعالی۔

قیامه بتربیة المسترشدین

لقد کان الشیخ محمد عبد الحکیم شرف القادری محظوظا، إذ أنه أوتی حظا وافرا من العلم والعمل الصالح، فأکرمه کثیر من شیوخ الطریقة بالإجازة والخلافة فی الطرق الصوفیة، أما المجیزون له من باکستان والهند فأسماؤهم کالتالی: شیخ الطریقة القادریة الشیخ محمد ریحان رضا خان، والفقیه الهندی الأعظم المفتی محمد شریف الحق الأمجدی رحمه الله تعالی، و شیخ الطریقة السید أحمد علی الأجمیری ،و فضیلة الشیخ أبو محمد السید أحمد شاه الأشرفی الجیلانی ، وشیخ الطریقة السید مسعود أحمد الأشرفی بن العلامة أبی البرکات السید أحمد الأشرفی القادری، والأستاذ الدکتور محمد مسعود أحمد بن المفتی محمد مظهر الله الدهلوی رحمهم الله تعالی۔ کما أجازه کذلک فضیلة الشیخ السید الشریف محمد أمین میاں البرکاتی حفظه الله تعالیٰ ، و شیخ الطریقة الشیخ محمد فضل رسول الرضوی بن المحدث الجلیل العلامة محمد سردار أحمد الجشتی القادری رحمه الله تعالیٰ، و فقیه العصر العلامة المفتی محمد أمین النقشبندی حفظه الله تعالیٰ، و السید الشریف العلامة مراتب علی شاه، الشیخ محمد حسن علی القادری حفظهم الله تعالیٰ۔"(۴۳)

"هؤلاء المشایخ أکرموا الشیخ محمد عبد الحکیم شرف القادری بالإجازة

والخلافة فى الطرق الصوفية نظر الجهوده العلمية وورعه، واتصافه بالمحاسن من الأخلاق، وهكذا أجازه بعض المشايخ من العرب فى الطريقة، فقد أجازه فى الطريقة القادرية الشيخ فضل الرحمن المدنى، كما أجازه فى الطريقة الرفاعية الشيخ السيد يوسف السيد هاشم الرفاعى، كما أجازه فى الطريقة الشاذلية الدكتور على جمعة (مفتى جمهورية مصر) وأجازه فى الطريقة التيجانيه الدكتور صلاح الدين، وهذه الإجازات فى الطرق الصوفية طرقٌ توصل إلى الحبيب المصطفى ﷺ، ولا تتيسر هذه النعمة بفضل الله تعالىٰ وكرمه إلا لرجلٍ ذو حظٍ عظيم۔"(٤٤)

جهوده من أجل الاصلاح

"لقد كان الشيخ محمد عبد الحكيم شرف القادرى رحمه الله تعالىٰ مصلحا دينيا وداعيا إلى الله على بصيرة، جاعلا نُصب عينيه قول الله تعالىٰ عز وجل: "اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَن۔"(٤٥)

لقد أدلى فضيلته ببعض التوجيهات والإرشادات للمسترشدين، نذكر منها العشرة الأولى فقط، وهى كمايلى: "الالتزام بالصلوات الخمس واجب للرجل والمرأة۔ أما الرجال فعليهم الالتزام بالصلاة مع الجماعة أيضاً۔ المقصر فى الصلوات سيظل محروما من بركات المشايخ۔ يجب على كل مريد أن يخمن الصلوات الفائتة ويؤديها حسب استطاعتها۔ ينوى المريد الصادق كمايلى: أصلى أول ظهر فاتنى۔" وهكذا ينوى فى الصلوات الأخرى من الفوائت۔ عند قضاء الصلوات الفائتة يصلى الفرض والوتر يعنى أنه يصلى عشرين ركعة فى كل يوم وليلة۔ وكذالک لايقصر فى الصيام، فإذا سقطت عنه صيام فليصمها قبل رمضان القادم۔ وكل من يملک النصاب عليه أن يدفع زكوة ماله، ومن لم يدفع الزكاة منذ سنوات فعليه أن يخمن ويدفع زكوة السنوات الماضية۔ الحج فرض على من استطاع إليه سبيلا، فعليه أن يحج فى أول فرصة فقد قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "من لم يمنعه من الحجّ حاجة ظاهرةٌ أو سلطانٌ جائزٌ أو مرضٌ حابسٌ فمات ولم يحجّ، فليمت إن شاء يهوديأً وان شاء نصرانياً۔"(٤٦)

عليه أن يبتعد عن الكذب، وارتكاب الفواحش، والنميمة، والظلم، والخيانة، والرياء، والتكبر وعن كل عمل محرم۔(۴۷)

لاتجوز السجدة لغير الله

"دعى شيخنا رحمه الله تعالىٰ فى الحفلة السنوية التى تسمى "عرسا" فى كل من باكستان والهند والتى تم عقدها بمناسبة الذكرى السنوية لأحد الاولياء الصالحين، فوجد فيها شيخا طاعنا فى السن، قيل عنه أنه من الأشراف فجاءه شاب وسلَّم عليه وسجد له بين يديه، وبعد قليل سجد هذا الشاب نحو ذالك الرجل من خلفه، فدعاه فضيلة الشيخ وقال له فى رفق: " لا تجوز السجدة للمخلوق وإنما السجدة لله فقط۔" وعندما دُعى فضيلة الشيخ ليقوم بمهمة إهداء الثواب والدعاء قال فضيلة: أريد أن تسمعوا قبل الدعاء حديثا رواه سيدنا قيس بن سعد رضه الله عنه، قال: أتيت الحيرةَ فرأيتهم يسجدون لمرزبان لهم، فقلتُ: رسولُ الله أحق أن يُسجد له، قال: فأتيتُ النبيَ صلى الله عليه وسلم فقلت: اننى أتيتُ الحيرةَ فرأيتهم يسجدون لمرزبان لهم، فأنت يا رسول الله أحق أن نسجد لک، قال: أرأيتَ لو مررتَ بقبرى أكنت تسجد له؟ قال: قلتُ: لا، قال: فلاتفعلوا۔"(۴۸)

رحيله الى دار البقاء

"كان الشيخ محمد عبد الحكيم شرف الدين القادرى بعد تدريس التفسير و الحديث النبوى الشريف قد أدرک بإحساسه و شعوره أن الدنيا فانية و الأخرى باقية، فكان و اضعا نُصب عينية قول الرسول ﷺ: "أذكرواهاذم اللذات"(۴۹)

"ومن هنا أدلى فضيلة ببعض الوصايا أمام كاتب السطور، كما نبه أهله بالاستعداد للرحيل إلى دار الآخرة۔ فعاش متمسكا بتقوى الله عزوجل، راجيا رحمته، وارتحل إلى دار الأخرة وقد اتخذ خير زاد لرحلته هذه۔ لقد ورد خبر رحيله إلى دار الأخرة فى مجلة ضياء الحرم كالتالى:" فى غرة شهر ستمبر ۲۰۰۷م انتقل العالم الدينى الجليل، بقية السلف، شيخ الحديث، العلامه

محمد عبد الحکیم شرف القادری رحمه الله تعالیٰ إلی دار الآخرة بعد مرض استمر مدة طویلة، أقیمت صلاة الجنازة بفناء مسجد السید علی بن عثمان الهجویری رحمه الله تعالی حضرها الآف من المحبین له۔"(۵۰)

كلمات العلماء

"لقد قال العالم الهندی الجلیل الشیخ عبد المبین النعمانی معبرا عن مكنون خاطره: "رحل الشیخ محمد عبد الحکیم شرف القادری و كأنه أخذ معه عالَماً من العلم و الأدب، لقد ذهب برحیله رونق مجلس التصنیف و التألیف و التحقیق، بیدو كأنه ذهب أمام حركة التضیف و التالیف و نشر العلم۔"(۵۱)

"قال الدكتور نور أحمد شاهتاز: " إن خدماته الدینة جدیرة بالدراسة فی أطروحة الدكتوراة۔"(۵۲)

"وقال الدكتور محمد مسعود أحمد: "كان یقول الحق دائما فلم یكن یجامل تلامیذه، ومریدیه، وأحبابه فی الحق، اتبع الشریعة الغراء طوال حیاته، وكان یعفو المسیئین إلیه، كما أنه كان یصل من قطع العلاقة معه۔۔۔ وإن ترجمته لمعانی القرآن الكریم إكلیل لأعماله العلمیة والأدبیة۔"(۵۳)

"لقد تحدث الأستاذ الدكتور محمد شریف سیالوی عن خدمات الشیخ محمد عبد الحکیم شرف القادری بقوله: "إن خدماته الجلیلة فی مجال إصلاح العقائد و الأخلاق من خلال كتبه، وخطبه، وقیامه بالتدریس جدیرة بالتقدیر والإجلال۔"(۵۴)

"وعن مكانة الشیخ محمد عبد الحکیم شرف القادری فی الدوائر العلمیة قال الدكتور طاهر رضا البخاری: "كان الشیخ متصفا بشخصیة علمیة ودینیة عظیمة، وكان من نوابغ فی عصرنا الراهن وسوف یستفید من ثقافته أهل العلم علی مرِّ العصور۔"(۵۵)

"وعن السمات العلمیة لشیخنا أخبر الدكتور محمد أشرف الجیلانی بقوله: " كان الشیخ محمد عبد الحکیم شرف القادری جامعا للكمالات، فكان محدثا، وفقیها، ومدرِّسا، ومصنفا، و محققا، ومترجما فی الوقت نفسه، وقد أكرمه الله

بكثير من المحاسن۔"(٥٦)

"وقال الدكتور سلطان ألطاف على: "كان المرحوم ذامكانة مرموقة فى مجال البحث والتحقيق۔"(٥٧)

وهكذا كانت حياة الشيخ محمد عبد الحكيم شرف القادرى معمورة بالعلم والعمل، فكان متعلما ثم معلما ومصلحا، عاش الشيخ فى باكستان ولكننى دُهشت عندما رأيت فى تفكيره وأسلوبه من التواضع، و سعة الأفق، و رحابة الصدر، وسمة الاعتدال ماكنت قد رأيته عن كثب فى الأساتذه المصريين خلال إقامتى فى مصر المحروسة قرابة ثمان سنوات، وهذا ما نتمنى أن نجد فى العلماء المعاصرين، لقد عاش شيخنا هذا فى خدمة العلوم الإسلامية والعربية وترك وراءه ثروة علمية ومئات التلاميذ، فرحمه الله رحمة واسعة۔

○○○

الهوامش والتعليقات

۱۔ الشعراء: ۶۲/۴۸

۲۔ شرف القادری، محمد عبد الحکیم، نور نور چھرے (الوجوه المنورة) مکتبه قادریه: لاهور، ۱۹۹۷م، ص: ۳۰-۲۸ (ملخصا)

۳۔ الفاروقی، اقبال أحمد، تذکره علماء اهل سنت لاهور، مکتبه نبویه: لاهور، ۱۹۹۷م، ص: ۴۱۰

۴۔ حوار صحفی أجراه محمد نواز کهرل مع الشیخ محمد عبد الحکیم شرف القادری، ننظر: المجلة الشهرية: "أخبار اهل سنت۔" عدد: یولیو، ۱۹۹۷ء، ص: ۱۲

۵۔ هذا اسم باللغة البنجابية معناه باللغة العربية: عطاء الله أو هبة الله

۶۔ السید یوسف السید هاشم الرفاعی، اسلامی عقائد، ترجمه: من اللغة العربیة إلی الأردية الشیخ محمد عبد الحکیم شرف القادری، الممتاز پبلی کیشنز، لاهور، ۱۹۹۰م، ص: ۷

۷۔ لقد اطلع کاتب السطور علی هذه الأحوال فی صغر سنِّه بنفسه، و مازال حتی الیوم مستغربا من کثرة عبادة جدتها، الأمر الذی نعجز عنه علی الرغم من الاطلاع علی أجر تلاوة القرآن، والذکر الإلٰهی، وخدمة الخلق (دکتور ممتاز أحمد سدیدی)

۸۔ جریدة صوت الأزهر الصادرة من القاهرة، ۲۳ من ینایر ۲۰۰۴، ص: ۱۰

۹۔ الفاروقی، اقبال احمد، تذکره علمائے اهل سنت و جماعت لاهور، ص: ۴۱

۱۰۔ المحدث الدهلوی، الشیخ عبد الحق، أشعة اللمعات شرح المشکوٰة، ترجمه: من اللغة الفارسية إلی اللغة الأردية الشیخ محمد عبد الحکیم شرف القادری، فرید بک سٹال، لاهور، ۱۹۹۰م، ج: ۴، ص: ۴۵ "مقدمه بعنوان: أشعة للمعات کے جلیل القدر مترجم"

۱۱۔ عبد الستار طاهر، محسن اهل سنت، رضا دار الاشاعت: لاهور، ۱۹۹۹م، ص: ۴۰-۴۳

۱۲۔ مجلة "الشرف"، عدد الشیخ محمد عبد الحکیم شرف القادری، شهر أکتوبر، سنة ۲۰۰۷م، ص: ۳۱۸

۱۳۔ شرف القادری، محمد عبد الحکیم، الجواهر الغالیة من الأسانید العالیة، مؤسسة الشرف: لاهور، ۲۰۰۵م، ص: ۱۰۲

۱۴۔ أنجم، زاهد حسین، اردو جامع انسائکلو پیڈیا، غلام علی اینڈ سنز، لاهور، ۱۹۸۸م، ص: ۱۴۹۲

عبد الستار طاهر، محسن اهل سنت، ص: ۲۴

۱۵۔ مجلة "الشرف" ص: ۴۴

۱۶۔ لایتسع المجال للتفصیل، ومن یرید الاطلاع علی أسماء التلامیذ للشیخ عبد الحکیم شرف القادری فلیراجع: مجلة "الشرف" شهر أکتوبر، سنة ۲۰۰۷م، ص: ۸۵، ومحسن اهل سنت، ۸۵

۱۷۔ مجلة "الشرف" شهر أکتوبر، سنة ۲۰۰۷م، ص: ۸۵

۱۸۔ شرف القادری، محمد عبد الحکیم، شجره هائے طریقت، مکتبه قادریه: لاهور، ۲۰۰۳م، ص: ۱۰-۱۱

۱۹۔ الأزهری، حافظ محمد منیر، الدکتور، تجدید التفکیر الدینی فی جهود العلامة محمد کرم شاه الأزهری، دار السلام: القاهره، ۲۰۰۸م، ص: ۹۵

۲۰۔ مجلة معارف رضا، کراتشی، شهر أغسطس، ۲۰۱۳م، ص: ۴۱

۲۱۔ المرجع السابق، ص: ۴۳

۲۲۔ ورد الفهرس لمؤلفات الشیخ وترجماته وحواشیه فی الکتاب: محسن اهل سنت، ص: ۱۹۸-۲۰۶

۲۳۔ مجلة "رموز" شهر نوفیمبر، ۲۰۰۴م، ص: ۹

۲۴۔ مجلة معرف رضا، ۲۰۱۳م، ص: ۵۴

۲۵۔ هذا ما اطلعت علیه بعد مطالعة أنوار الفرقان فی ترجمة معانی القرآن مرارا وتکرارا۔ (دکتور ممتاز أحمد سدیدی)

۲۶۔ لم یُذکر تاریخ الطبع فی "أنوار الفرقان فی ترجمة معانی القرآن" غیر أنه طبع بفضل الله تبارک وتعالی فی شهر ینایر سنة ۲۰۱۵م (دکتور ممتاز أحمد سدیدی)

۲۷۔ مجلة "الشرف" ص: ۳۱۲

۲۸۔ رسالته التی کتبها فضیلة الدکتور عبد القدیر خان فی الثامن من شهر یونیو سنة ۲۰۱۲م "مطبوعة فی الصفحة الأخیرة من أنوار الفرقان فی ترجمة معانی القرآن"

۲۹۔ المحدث الدهلوی، عبد الحق، الشیخ، تعارف فقه وتصوف، ترجمه من اللغة العربية إلى الأردية الشيخ محمد عبد الحكيم شرف القادری، مکتبه قادریه، لاهور، ۲۰۰۰م، ص: ۶۷

۳۰۔ التقيت مع فضيلة الشيخ بدر الاسلام الصديقى بالزاوية السلطانية فی مدينة جهلم فی الرابع عشر من شهر مارس سنة ۲۰۱۵م

۳۱۔ تطلق كلمة الوظائف فی اللغة الأردية على الأوراد التى يوصى بها مشايخ الطرق الصوفية۔ (دكتور ممتاز أحمد سديدى)

۳۲۔ شرف القادری، محمد عبد الحكيم، مرتب: مجموعه وظائف، مکتبه قادریه، لاهور، ۲۰۰۷م، ص: ۱۵، نقلاعن: تمهيد أبى شكور السالمى، طبعة لاهور، دون سنة الطبع، ص: ۱۰

۳۳۔ بوصیری، الشیخ محمد بن سعید، قصیدة البردة، ص: ۲۴

۳۴۔ مجلة "الشرف" شهر أكتوبر، سنة ۲۰۰۷م، ص: ۳۵۰

۳۵۔ المرجع السابق، ص: ۳۱۸

۳۶۔ المرجع السابق، ص: ۵۳

۳۷۔ المرجع السابق، ص: ۵۳

۳۸۔ من أراد الاطلاع على هذه النماذج فليرجع الى مقال كتبته تحت عنوان: "العلامه محمد عبد الحكيم شرف القادرى و ذوقه الأدبى۔" مجلة شهرية ضياء حرم، شهر سبتمبر ۲۰۱۲م، ص: ۵۹-۶۴

۳۹۔ بوصیری، الشیخ محمد بن سعید، قصیدة البردة، وترجمه: الشيخ محمد عبد الحكيم شرف القادرى من اللغة العربية إلى الأردية، مکتبه قادریه، لاهور۔ ۲۰۰۴م، ص: ۳۴

۴۰۔ عبد الستار طاهر، محسن أهل سنت، ص: ۵۴

۴۱۔ المرجع السابق، ص: ۵۴

۴۲۔ المرجع السابق، ص: ۷۰

۴۳۔ شرف القادری، محمد عبد الحكيم، الجواهر الغالية من الأسانيد العالية، مؤسسة الشرف، لاهور، ۲۰۰۵م، ص: ۲۱-۲۴

۴۴۔ المرجع السابق، ص: ۲۱، ۲۲

لم تكن إجازة الطريقة الرفاعية من الشيخ السيد يوسف السيد هاشم الرفاعى و اجازة الشيخ

صلاح الدين حفظهما الله تعالى في الطريقة التيجانية مذكورة في: "الجواهر الغالية من الأسانيد العالية۔" إلا أنني رأيت الإجازتين ضمن الإجازات التي حظى بها الشيخ محمد عبد الحكيم شرف القادري من الشايخ لذا ذكرتهما هنا للإفادة۔ (دكتور ممتاز أحمد سديدى)

۴۵۔ النحل: ۱۲۵/۱۶

۴۶۔ رواه الدارمی، ۱۷۹۲

۴۷۔ شجره هائے طريقت، ص: ۱۹-۲۰

۴۸۔ رواه أبو داؤد

۴۹۔ جامع الترمذی: ۲۲۲۹، سنن النَسائی: ۱۸۰۱

۵۰۔ مجلة ضياء الحرم: لاهور، اكتوبر ۲۰۰۷م، ص: ۱۳

۵۱۔ ماهنامه كنز الايمان: دهلی، اكتوبر ۲۰۰۷م، ص: ۳۹

۵۲۔ فقه اسلامی: ستمبر ۲۰۰۷م، ص: ۳

۵۳۔ مجلة الشرف، ص: ۳۷۰

۵۴۔ المرجع السابق، ص: ۳۴۰

۵۵۔ المرجع السابق، ص: ۳۲۵

۵۶۔ المرجع السابق، ص: ۳۲۵

وقد عبد الشيخ المفتی محب الله النوری عن مشاعره قائلا:

"إن قوافل الأحياء راحلة إلى دار البقاء وهذه سنة الحياة، إلا أننا نصاب أحيانا برحيل شخصيات لا نجد لها بعدها بديلا فضلا عن المثيل۔"

۱۔ ثلاث كتب للامام محمد صالح فرفور رحمه الله تعالىٰ

(أ) من نفحات الخلود (ب) من رشحات الخلود (ج) من نسمات الخلود

۲۔ النابلسی، للعلامه، عبد الغنی، كشف النور عن أصحاب القبور

۳۔ النبهانی، للعلامه، يوسف بن إسماعيل، الشرف المؤبد لآل محمد

۴۔ هل نحتفل "من إصدارات دار الإفتاء بدبئی"

۵۔ سميط، للسيد زين آل، مسائل كثر حولها الجدل والنقاش

۶۔ الرفاعی، للسيد، يوسف السيد هاشم، أدلة اهل السنة والجماعة

۷۔ زكی ابراهيم، للشيخ، محمد، نداء إلى۔۔۔

۸۔ بردۃالبوصیری

۹۔ الجزولی، لشیخ، محمدبن سلیمان، دلائل الخیرات وشوارق الأنوار

۱۰۔ الشاذلی، للشیخ، أبی الحسن علی بن عبداللہ، حزب البحر وحزب البر

۱۱۔ الھمدانی، للشیخ، السیدعلی، الأورادالفتحیہ

OOO

Political services of Meher Ali Shah in Freedom Movement

☆Abdul Qadir Mushtaq

Abstract:

The popular tradition of Chishtiya order warned their disciples against consorting with kings and rulers. They did not have a desire of government services or never accepted endowments due to their belief that after Khalifat-i-Rashida the paths of religion and politics had separated. They believed in the separation of religion and politics and that serving the state, to them, was no longer identical with serving the religion. It is fact that during the British government in the sub-continent, a closed relationship developed between the political institutions and religious. It was British government's view that those Shrines were political force and could prove helpful in strengthening their rule in the sub-continent. The British government recognized the influence and authority wielded by the heads of the

☆Assistant Professor, deptt. of History & Pakistan Studies, GC University

shrines. Sajjada Nashines of the different shrines in all the parts of the sub-continent were considered quite powerful local magnets. The British government used them in administrative matters for their own benefits. The Sajjada Nashines of South West Punjab (Shahpur, Sahiwal, Jhang and Multan) played administrative role as Zaildars, Honorary Magistrate and as member of district boards and councils. These institutions had become an effective channel to gain political support of the rural population in the late 19th century. It was the factor that compelled the British government to recognize the importance of religious institutions in the sub-continent. What was the response of Meher Ali Shah towards the British government? How did he respond the contemporary political challenges created by British government? How did his actions defend the image of Islam in the western world and defend other Sufies? This paper contains the answer of above mentioned question. The research will explore the different aspects of Meher Ali Shah's political efforts during British Empire.

Key Words:

Tradition, Chishtiya, Consorting, Kings, Rulers, Endowment, Identical, Religion, Sub-Continent, Shrines, Influence, British, Administrative, Sajjada Nashines, Institutions, Mehar Ali Shah.

Introduction

Syed Meher Ali Shah followed his earlier Chishti tradition of non-interaction with kings and courts. No doubt, he was well-aware of the need and significance of the modern technology and education which were being introduced by the British but he always great importance to the religious institutions and religious knowledge. He had no objection over the learning of modern European sciences and English language and also considered these essential for modern times. But he was also apprehensive of some English literature and other writings which he regarded harmful for religious and national cohesion. Therefore, in his view it was imperative to have knowledge of religious sciences and its implementation in the modern society.(1)

Non-Cooperation with British government

It is said that the British government offered Meher Ali Shah about 400 squares of land to upgrade the facilities of education at madrassa of Golra Sharif but he refused to accept this endowment.(2)

On the occasion of the visit of King George V to India in 1911, a darbar was held at Dehli, to celebrate the coronation ceremony. Meher Ali Shah was also invited to participate in this ceremony, but he refused to attend. It was suggested that he was unhappy with the role of British in the Balkan and Tripoli during early months of 1911.(3) It was also rumored that on this occasion, the government had intentions to make an announcement regarding the annulment of the partition of Bengal. At that time, Meher Ali Shah did

not want to hurt the emotions of many of his disciples, belonging to Punjab and North-West Frontier Province. The British government made efforts through different personalities to persuade him to participate in the ceremony but Meher Ali Shah refused to attend the ceremony with the statement that he was a dervish and it was not proper for him to attend the darbars of kings and emperors. Actually, he had a large personal estate inherited from his forefathers; he did not like to go to royal courts even for expedience.(4)

This refusal of Meher Ali Shah created problems for him and he was directed by the government to present himself before of Deputy Commissioner of Rawalpindi district but again he refused to go to the court of Deputy commissioner. This news caused a great deal of concern and agitation among his disciples in the NWFP and Punjab provinces. Therefore, the Lieutenant governor directed to the Deputy Commissioner of Rawalpindi to visit Meher Ali Shah personally, accompanied by magistrate Muzzaffar Khan and Mian Karim Buksh Sethi of Peshawar. The main purpose behind the official move was to remove the misunderstanding between the government and Meher Ali Shah.(5)

Around this time, some people decided to exploited Meher Ali Shah’s refusal to attend the royal darbar. They brought up the charge that Meher Ali Shah was Pir (spiritual leader) of the thieves and robbers living in the neighboring villages. And he was providing means of livelihood to dependents of escaped convicts of the area. The death of dacoit named Jahamdad, and Meher Ali’s participation

in his funeral prayers gave these people a further occasion to promote their vicious designs. They charged that while other ulema had refused to join the funeral prayers of this dacoit but Meher Ali Shah had ready to done so. This time, Deputy Commissioner took notice and asked Meher Ali Shah to clarify his position. At this occasion, the British government decided to deport him and this news was conveyed to Meher Ali Shah by a Muslim governmental official who had never met Meher Ali Shah before but nevertheless was his devotee at heart and informed him about government's decision to deport him from the country on the basis of a confidential recommendations forwarded by the intelligence agencies. Meher Ali Shah merely smiled at this disclosure and said, "The government which is planning to deport me doesn't seem to known what providence plans to do with" Not long after this, the British government got involved in a life and death struggle with Germany in the 1st World War (1914-18) and government file pertaining to Meher Ali Shah's proposed deportation had to be set aside indefinitely.(6)

Meher Ali Shah did not feel frightened of the existing rulers and believed upon God in spite of the threats from the functionaries of the British government. He wrote the Punjabi verses by the supplication addressed to Shaikh Abdul Qadir Jilani and seek spiritual help from the Shaikh against the existing rulers.(7)

During his whole life, he never visited the residence of the officers in spite of the invitations. A newly appointed Deputy Commissioner of Rawalpindi (an Englishman) sent a message to

Meher Ali Shah to see him at his residence. Meher Ali Shah replied to the Deputy Commissioner in these words "There can only be two possible reasons for our meeting; either I may need your help in getting something. This, however, is not the case or you may have some reason to see me, if so, it is appropriate for you to come and see me instead of the other way round. You should, therefore, please consider your summons to me to see you". On receiving the reply of Meher Ali Shah, The Deputy Commissioner sought the advice of one Qadi Sirajuddin (Barrister-at-Law, then serving as a government advocate) in this matter. The latter apprised the D.C. of the high religious and spiritual status of Meher Ali Shah and advised him to proceed in the matter with care and discretion. Grasping the soundness of this advice, the D.C. informed Meher Ali Shah that he would come himself shortly to see him.[(8)]

During the 1st World War (1914-18), a campaign was launched by the British government for the recruitment of Indians so that the soldiers from India would be available for war. This campaign provided an opportunity to many loyalists, including landed aristocracy and some Pirs and Sajjada Nashines to urge their followers to enlist themselves in the British Indian Army for getting more favor from British. The recruitment campaign could achieve success with the help of Sajjada Nashines and landed elite. Meher Ali Shah was approached by the political authorities for persuading his followers for recruitment in the army. Meher Ali Shah replied to the British officials that they should not except from him and other ulema for

their support in the recruitment campaign. His attitude was quite neutral because he had neither urged his Murids for recruitment in the army nor he had persuaded them to desist from military service. During this period, many British officials contacted him, time and again to win his support and he was also kept under observation by the Police intelligence department.(9)

There is not blinking the fact that the British officers were impressed by the spiritual authority of Meher Ali Shah. They often visited Golra Sharif for pray. A British officer who had encamped outside Golra requested Meher Ali Shah to pray for the birth of male child to his wife. Another Englishman, who had come from England in connection with the exploration of oil in Khawr area of Rawalpindi district, met Meher Ali Shah and sought his prayers for success in his mission. He also asked his successor to seek Meher Ali Shah's prayers before embarking upon his task in the Khawr area. Meher Ali Shah admitted that the officer in question was known to him and he prayed to Allah as requested by the visitor.(10)

Meher Ali Shah and Khilafat Movement

Khilafat is the name of that institution which was established to fill the position of the Holy Prophet (PBUH) as the head of Islamic state. The title of Khalifa-Tul-Rasool Allah i.e. vicegerent of the Prophet of Allah, was adopted by the first pious Caliph Hadrat Abu Bakr on his assumption as the first ruler of the Islamic State. The person who occupied the Khilafat was regared as a highly respectable and venerated person by the entire Muslim community till the down

fall of Ottoman Empire. When the 1st World War (1914-18) was broke out, Sultan Abdul Majeed was the Caliph of the Ottoman Empire. The Turkish Khilafat, being the successor of the Orthodox Caliphate of the Holy Prophet, was respected and held in highest reverence and esteem by the Muslims of all over the World. As such the Muslims of India also had the great respect for the Caliph and the institution of Khilafat. The institution was regarded as a central authority and power for the Muslims who could not tolerate any humiliation to the Khilafat by any other power. The Ottoman Sultan was known by the title of Khalifa-Tul-Muslimin, because of his being the custodian of Islam's holy places and head of the largest Islamic Empire. After the out break of War, the circumstances compelled the Ottoman Empire to fight the allies. It, therefore, allied itself with Germany. The Indian Muslims showed their sympathies with their Turkish brothers. The British government adopted the policy to keep the Muslims of India under control and did not allow them raise any voice in support of Khalifa, Sultan of Turkey. At the end of the 1st World War, the victorious European powers and their ally USA succeeded in virtually destroying and dismembering the once vast Ottoman Empire, whom they had derisively named "The sick man of Europe" because of its rapid decline from its former pedestal of glory. This came as great shock to the Muslims of India, who had lost their great Mughal Empire to the British in the mid-nineteenth century and had since then come to regard the Ottoman Empire as the last remaining symbol of Islam's erstwhile majesty and grandeur. The

tragic development led by the common people, the political leaders and especially the ulema and spiritual leaders of Muslims belonging to various schools, to grid up for the defense of the Islamic Caliphate. They were not prepared to see the dismemberment of Turkey at any cost and therefore, for the protection of the status of the Ottoman Empire and of the holy places, they launched the Khilafat movement.[(11)]

Many ulama including Meher Ali Shah considered Turkish government as an Islamic government but they did not rank it as an Islamic Khilafat. According to them, the real Khilafat remained during the period of Khilafat-e-Rashida and after the death of Hadrat Hassan (The 5th Caliph), the monarchy started. Other ulama who endorsed Meher Ali Shah's views were Maulana Ashraf Ali Thanvi and Maulana Ahmed Raza Khan Brelvi.[(12)] They held that in accordance with an Ahadith of Holy Prophet (PBUH), the righteous Caliphate would remain in existence for one thirty years after passing away the Holy Prophet (PBUH) and thereafter would be changed into a monarchy for which the words "adudiyat" (Bitterness) and "Jabr" (Coercion) were used in the Ahadith. It was their opinion that if a Sultanate of Turkish pattern were to be accepted as Khialfat, then Immam Hussain who had been killed on the orders of Yazid bin Mu'awiyah and the death of Immam Abu Hanifa in prison, ordered by Abbasid Caliph namely Mansur, would have to be considered as rebels. Yazid bin Mu'awiyah was responsible for the martyrdom of Immam Hussain in the bettle field of Karbla and Mansur responsible

for the death of Immam Abu Hanifa in prison, both personalities claimed to be Khulafa of Holy Prophet (PBUH). Meher Ali Shah refused to accept them the Khulafa and passed the fatwa that Khilafat remained only for thirty years and thereafter it changed into monarchy because Yazid bin Mu'awiyah and Mansur could not be regarded as the vicegerents of the Holy Prophet due to their traits. That' why; he expressed his inability to support the Khilafat movement.(13)

Meher Ali Shah and his cohorts used to view every issue from purely Shariah standpoint and they did not consider the Turkish Ottoman sultanate to be equivalent to the Islamic Khilafat. No doubt, these eminent personalities supported the Turkish cause until such time as the new Turkish revolutionary government of Mustafa Kamal Pasha declared Turkey to be purely secure polity in the 1930s. But it is remarkable that during the Khilafat movement, Meher Ali Shah did not forbid his devotees and associates from taking in it despite his own reservations for the movement. When, for example, Mawlana Ghulam Muhammad of Bahawalpure arrived at Golra for asylum. Meher Ali Shah not only prayed for his safety but also provided him his full support against the British government. Although Meher Ali Shah had sympathies for Muslims and was worried about the protection and future of the holy places yet he opposed the Khilafat, Hijrat(14) and Tark-i-Mawalat(15) (Non-cooperation) movements.(16)

In the 1919, when non-cooperation movement was started by the Hindus and the Muslims, Meher Ali Shah did not like the movement and opposed it. During this period, the Muslims did some

audacious things which were totally against the teachings of Islam like a resolution about the abandoning of cow slaughter was passed. Meher Ali Shah showed his displeasure over this resolution. He was of the view that such steps were benefiting the Congress. According to him, it was unlawful for the Muslims to obey the orders of Gandhi and he declared the resolution un-Islamic that was passed by the Hindus and the Muslims about the abandoning of cow slaughter. Meher Ali Shah emphatically denied the legality and permissibility of the Muslims's cooperation, not only with the Hindus but also with the Christians and Jews. He also rejected the thesis then being propagated by the pro-Congress ulema about the repugnancy of cow-slaughter and instead invited attention to its good points mentioned in the Shariah. Meher Ali Shah also ruled out the Gandhi's suggestion of using Khaddar (Home-spun cotton cloth) for purpose of dress on common scale, which Gandhi had advocated as one of the main props of his movement of non-cooperation against the British in order to end the market for their textile industry. Meher Ali Shah made it clear that no such restriction had been imposed by the religion of Islam. He rejected the measures one by one commended by Mahatam Gandhi and his followers; Meher Ali Shah claimed to have done so on the basis of the Quran and the Sunnah. This alienated all the Muslims leadership of the Khilafat movement, who, failing to judge the designs of Gandhi to use Muslim cooperation only as a means of converting Hindu Congress into a national movement, had extended their loyalties to him even in contradiction of clear Islamic injunctions.

Consequently they tried to paint Meher Ali Shah as a loyalist and supporter of the British government. But the latter events proved that the stance of Meher Ali Shah concerning the Khilafat movement and about the inadvisability of the Muslims cooperation with Congress had been correct. When Gandhi felt that Hindu-Muslim cooperation had become tactically redundant, he changed his stance on the issue of Muslim cooperation with Congress. Many of those who had earlier thought it fit to ignore Meher Ali Shah's sincere and well-meaning pleadings on the subject and had instead dubbed Meher Ali Shah as a government loyalist at heart, were thus forced to acknowledge the error of their ways.[17]

After Germany's defeat in 1st World War[18] , the allied powers decided to divide the territories of defeated countries among themselves. As a result, Turkey had to lose much of its territory and was confined to small units. The Muslims of sub-continent were perturbed over it. The leading ulama proposed Muslims to leave India as they declared it Dar-ul-Harb. The only rock which the wide spread storm of pro-Hijrat and pro-Khilafat public opinion encountered at this time was that of the holy shrine of Golra Sharif. Due to this, the hostile editorials were written by many newspapers, satirical verses composed by poets and attacks launched by scholars and some mashaikh form different platform against Meher Ali. But Meher Ali made it clear there was no justification in Quran and Ahadith for this kind of migration. At that time, the Muslim population in India was about seven million, if the country was to be declared Dar-ul-Harb,

Muslims would be deprived of observing many of Islamic rituals and ceremonies and their separate identity would be hurt. Moreover if all the Muslim population were to migrate, no country could absorb all of them, so the result would be disastrous. Therefore, the Muslims who migrated to neighboring Afghanistan started come back to India. On their way back, they had to face many difficulties because before migration they had disposed of their properties on cheaper pieces. When they returned, they had even no houses to live. In order to resolve this problem of migrants, the government ordered that their lands and properties should be given back on the same prices at which they were purchased. During this period, many ulama proposed to prohibit the performance of Jumma prayer in various cities of the sub-continent but Meher Ali Shah was against such steps. He opposed all such steps and made efforts to begin the Jumma prayer.(19)

Maulana Zafar Ali Khan, a staunch supporter of Khilafat movement and the learned editor of the them well known Urdu daily newspaper, met Meher Ali Shah in 1920 in order to exchange views with him concerning the Khilafat and Hijrat movements. During this meeting, Zafar Ali Khan presented his point of view on the subject and favored the course of action adopted by the common ulema with respect to these movements and on the issue of Hindu-Muslim cooperation etc. Meher Ali Shah presented his points in the light of Islamic Shariah. Zafar Ali Khan was at that time unable to offer any convincing counter arguments. Meher Ali Shah convinced Zafar Ali Khan about the un-Islamic things that had become the part of the

movement. At the end of the meeting, Zafar Ali Khan, who despite his stance on the subject which differed from that of Meher Ali Shah, was sincerely desirous of the freedom of Muslims from British subservience, remarked wistfully that he had come to the holy Shrine of Golra only to beg independence for the Muslims of India. Upon these remarks Meher Ali Shah raised his hands in prayers to Allah for this purpose and within ten years of his passing away in 1937, the prayer of Meher Ali Shah brought fruit and Pakistan emerged on the horizon as an independent state in August 1947. It is remarkable that Zafar Ali Khan decided to quit the rank of Congress after his meeting with Meher Ali Shah. The annual meeting of Congress provided an opportunity to Zafar Ali Khan to realize the gravity of the situation when Gandhi refused to allow a break in the proceedings to enable Muslim members of the audience to offer their prayers. It created resentment among the Muslims and Zafar Ali Khan. He walked out of the meeting, announced his exist from the Congress ranks and from then became an implacable adversary of Gandhi. The stand of Meher Ali Shah on the issues of Khilafat and Hindu-Muslim unity was thus provide ntially vindicated within a relatively short time.(20)

Hakim Shamusuddin, a close mate of Meher Ali Shah during his student days and a renowned physician, was the staunch supporter of Khilafat movement. He wrote numerous critical letters to Meher Ali Shah about his stand on the movement. He also accused him of having a soft corner for the British government of the day. He even slated Meher Ali Shah's spiritual inability to save him from the

clutches of a Hindu woman, with whom he had fallen in love during his campaign for Hindu-Muslim unity. Meher Ali Shah replied to the letter which have been included in the book entitled Maktubat-e-Tayyibat. No doubt, the latter events like the maneuvering of the Khilafat movement by the Hindus proved Hakim Shamusuddin that he was at fault about establishing his views about Meher Ali Shah. Several other things also exposed the reality upon him that neither Meher Ali Shah favored the British nor was he afraid of the penalties associated with their government, as alleged by the people like him. He even passed a ruling that service in British army was not permissible for the Muslims and also refused to accept the invitation of the coronation ceremony of George V, the British Emperor of India, held in Dehli in1911 which people like Hakim Shamusuddin considered a high honor. He gave the reason of not attending the ceremony that a dervish had nothing to do with royal courts. Meher Ali Shah also rejected the government's offer of making his son Babuji an honorary magistrate and even refused to meet the Deputy Commissioner of Rawalpindi in his office, with the remark that if he was desirous of meeting him, and he was welcome to come to Golra. All these events left deep impact upon Hakim Shamusuddin and his views Meher Ali Shah underwent a complete transformation and he was forced to admit that Meher Ali Shah was a true well-wisher of his followers without any distinction whatsoever. Though, he lived only for short period thereafter but he showed respect and allegiance to Meher Ali Shah and even on his last visit to Golra before his death, he

decided to travel on foot from Golra railway station to the Shrine as a mark of respect.[21]

Rowlett Act and Meher Ali Shah

In India, after the 1st World War, on the issue of Rowlett Act[22] , people came out and defied the government. The Rowlett Act was published soon after the Montague-Chelmsford Report. Both the reports added fuel to fire and Indians used to think that they had been tricked by the British. Rioting started with the attacks on the Europeans and the banks. On 13 April 1919, they decided to stage a demonstration at Jallianwala Bagh, Amritsar. General Dyer[23] was directed by the authorities to reach Amritsar on 13 April 1919, and he immediately surrounded the gathering from four sides. To disperse the mob, he ordered firing. A total of 1650 rounds were fired which resulted in heavy causalities. According to official estimates 379 people were killed and 1200 persons were wounded. General Dyer was appreciated for saving the British prestige and this action was approved by the provincial government. Following the firing incident at Amritsar, anti-government people were arrested from all over the province.[24]

When the governor of Punjab Sir Micheal Francis O' Dwyer was recalled to England, some natives of Lahore city arranged a farewell ceremony. In this ceremony many Muslims, including the Sajjada Nashines of various shrines were invited to participate. On this occasion, it was proposed to present him a vote of thanks (Sipasanama) on behalf of the participants. In this farewell ceremony,

Meher Ali Shah was also invited but he denied to participate. Malik Umer Hayat Khan Tiwana insisted Meher Ali Shah on joining the farewell party and on his insistence Meher Ali Shah agreed to send his son Ghulam Muhyud-Din. On this occasion, the sipasnama was presented and were asked participants to sign it. Ghulam Muhyud-Din showed reluctant to sign it but on the insistence of Malik Umer Hayat Khan Tiwana, he signed it.(25)

In 1926, Maulana Ata Ullah Shah Bukhari visited Multan and during his visit, he criticized Pirs and Sajjada-Nashines who participated in the farewell ceremony of Sir Micheal Francies O' Dwyer. He was of the opinion, "By presenting the sipasnama before an Englishman, you have blackened the teachings and principles of your forefathers, and it will not be washed away till the Day of Judgment. If I support Ibn Saud, you brand me as Kafir (infidel) and if you sign the death warrant of Turks, then you are Momin (Faithful Muslim), and I struggle and fight for the liberation of India from the British then you can call me a culprit and consider me at fault. I wish extirpation and destruction of British government while you solicit for the success of British government in your prayers.

> "O tailless dogs of British government wait for the trumpet of Israfil when you will be indicted and you will be able to see it in the mirror of shame. Every bead of your rosary reflects you fraud. In the coils of your turbans a thousand vices prosper. You see them but your tongues are silent."(26)

These comments of Ata Ullah Shah Bukhari created depression and distress among the Sajjada Nashines of the Punjab. They started a violent campaign against Ata Ullah Shah Bukhari. It is appropriate to mention that Atta Ullah Shah Bukhari was a disciple of Meher Ali Shah but on this particular issue on signing the sipasnama by Muhyud-Din, he broke of all the connections with Meher Ali Shah.

Dr. Allam Muhammad Iqbal, a great philosopher also showed his displeasure at the role of the Pirs and Sajjada Nashines of the Punjab. He was unhappy with the Pirs due to the sipasnama presented to Sir Micheal Francies O' Dwyer. In one of his poem "Punjab Ka Pirzadon Say" he criticized them vehemently in the following words.

> "I attended the grave of Mujadid Alaf Thani (Shaikh Ahmed Sirhindi), the soil which is source of brightness beneath the sky. Salt felt ashamed of the jots of this soil. The soil which has covered a person which was endowed with the secrets of this universe. Who did not submit before Jehangir (the fourth Mughal emperor) and whose zealous spirit is source for fervor of Ahrars. Who was the protector of the Muslim nation in India? To whom God has forewarned apropos. I have requested him to endow me with the quality of Faqr because my eyes are clear sighted but not vigilant. I was answered that the chain of Faqr are displeased with the Punjab region. The land which produced crest is not the abode of mystics. The passion of truth were because of the Faqr's head dress but the desire of tall tassel is intoxicated for the government service."(27)

Relations with the Muslim Rulers

Meher Ali Shah was against the establishing of the relations with personalities placed in highly positions. He always adopted indifferent attitude towards matter which could compromise his spiritual position. Meher Ali Shah treated all those who came to him with equal consideration and solicitude, regardless of their status. He devoted himself for the poor, the lowly and provided solace and comforts to the poor in every possible way. He never felt hesitation in saying or doing anything which he sincerely believed to be true and in the wider interest of Islamic Ummah, even though he was opposed by powerful forces of exigency and opportunism. History abounds in examples of ulema and Sufis who stood firm in the face of despotic tyranny as well as various forms of enticement and flatly refused to carry out improper wishes and commands of the rulers. In doing so, they suffered untold privations and some even lost their lives for the noble cause. The examples of great men like Immam Abu Hanifa, Immam Ahmad Bin Hambul and many others, who were subjected to autocratic oppression but refused to budge from their truthful stance until they met martyrdom, stand out as beacon of light to the later generations. Meher Ali Shah also followed this tradition. There were many instances in which persons with high worldly status sought the prayers and blessings of Meher Ali Shah from time to time. Amir Habib Ullah Khan, the ruler of Afghanistan visited Golra for seeking the pleasure of Meher Ali Shah. Nawab of Bahawalpur, Sadiq Muhammad Khan had great respect for him. Nawab Sir Umer Hayat

Khan of Kalra Estate (Sargodha) and his son Khizar Hayat Khan, Nawab Muhammad Hayat Qureshi, Sir Sikander Hayat Khan (former Chief Minister and Governor of Punjab), Mian Mushtaq Ahmad Gurmani, Nawab Abdullah Khan of Khan Garh, all belonged to rich and influential families but were sincere devotee of Meher Ali Shah. These personalities gained moral benefits due to their devotion to Meher Ali Shah. Some of them were blessed with male issues; some other were able to give up drinking and became pious people, while still others rose to very high positions in the government set-up. Hajji Mian Karim Bakhsh, Mian Abdul Karim and Abdul Rashid of Peshawar, Mian Imam Bakhsh of Multan were highly affluent people but lived auster and pious lives. They also rendered important services to the Shrine of Golra. These included the construction of a road from Golra railway station to the Shrine.[28]

1. Faiz Ahmad Faiz, Mehre-e-Munir, P. 284
2. Ibid., P. 287
3. Muhammad Ali Charagh, Akbbrin-e-Tehrik-e-Pakistan, P. 211
4. Faiz Ahmad Faiz, Mehre-e-Munir, P. 287
5. Qazi Abd-ur-Raqeeb, Swanih Hadrat Qibla-e-Azam Golra Shrif, P. 44
6. Hafeez-Ur-Rehman, Saints and Shrines in Pakistan, P. 400
7. Fadil Khan, Mehre-e-Munir, pp. 262-63
8. Ibid., P. 262
9. Ibid., P. 264
10. Charagh, Akbbrin-e-Tehrik-e-Pakistan, P. 213

11. Faiz Ahmad Faiz, Mehre-e-Munir, P. 266
12. Ibid., P. 246
13. Ibid., pp. 249-250
14. In the non-cooperation movement, the ulama issued a fatwa and declared India Dar-ul-Harb. This movement spread widely, particularly in the North-West Frontier and Sind. At the result of this fatwa, the thousands of the Muslims, as many as 18,000 in the month of August 1920 itself and mostly from Sind and the North West Frontier, migrated to Afghanistan. They had sold their properties and their land. They travelled a long journey to Afghanistan with their wives and children. They had been told that Afghan government would welcome them with open arms. But it was difficult for Afghan government to accommodate a large number of muhajrains. Khalid Bin Sayeed, Pakistan : The Formative Phase (1857-1948), p. 69
15. It was a Gandhi's resolution that was adopted by 1,886 votes in favor with 884 votes cast against it. Gandhi persuaded the Congress party to launch non-cooperation movement and he moved it as a resolution in the session of the Indian National Congress at Calcutta. The session passed this resolution with a great majority. The non-cooperation movement was to be given effect to in the following manners; surrender of titles and honorary offices and resignation from nominated seats in the local bodies, refusal to attend government Levees etc, gradual withdrawal from schools and colleges owned and aided by the government, gradual boycott of the British courts by lawyers and litigants, refusal on the part of the military services, withdrawal by the candidates of their candidature for elections to the Reformed Councils and refusal on

the part of the voters to vote for any candidate who may, despite the Congress advice, offer himself for the election; boycott of foreign goods. The issue of Khilafat was primarily a religious movement for the Muslims. The Jamiyat al Ulama-e-Hind issued fatwa signed by 925 eminent Muslim divines sanctioning the program of non-violent, non-cooperation. No doubt, the movement was dominant by religious ideas and religious leaders. Jinnah was against the Gandhi's resolution the fatwa of religious scholars and he pointed out that he was not convinced of the practicability of Gandhi's scheme. Actually Jinnah was determined to follow constitutional path and he also predicted that Gandhi's program would lead to disaster and bring about conflict between Hindus and Muslims. According to him, Gandhi's extreme program had for the movement struck the imagination mostly of the inexperienced youth and the ignorant and the illiterate. Khalid bin Sayeed, Pakistan The Formative Phase (1857-1948), p. 48. Also see Matlubul Hasan Saiyid, Muhamad Ali Jinnah: A political Study, p. 186

16. Hafeez-Ur-Rehman, Saints and Shrines in Pakistan, P. 399
17. Raqeeb, Swanih Hadrat Qibla-e-Azam Golra Shrif, P. 47
18. The World War 1st, there were many causes behind this but the important was the system of secret alliances. Before 1914, Europe was divided into two armed camps. In one camp were England, France, Russia and Japan. In other camp were Germany, Autria-Hungary, Turkey and Italy. There was not only jealous but also enmity between the two camps. It was mutual hatred created by this system of secret alliances which ultimately brought about the War of 1914. Palmer Perkins, International Relations, P. 14

19. Fadil Khan, Mehre-e-Munir, PP. 252. 255
20. Ibid., P. 254
21. Ibid., pp. 255-56
22. In the year of 1917, a commission was formed and Sir Sidney Rowlett was the in charge of that commission. The duty that was assigned to this commission to analyze the causes of rebellious activities in India and also to suggest the solution. This commission analyzed the circumstances and presented its report that was published in April 1918. On the basis of this report, two drafts were presented to the Legislative Assembly. Majority of the elected members voted against it but it was passed with the support of the thirty four official members and was enforced with the approval of Governor General on 23 March 1919. Rowlett Act deprived a man of his liberty. It suggested that in the event of the government being faced with anarchical and revolutionary movements, the government could deprive a man of his liberty and intern him for a long period. According to this Act, it was not the responsibility of the government to prove the offence of the convicted person. Instead if the convicted person could not prove his case he would automatically to be decided an offender. It was also very strange for the poor of the charge the complaint could bear testimony of a deceased person. But under this Act, the convicted person was not allowed to get the services of a lawyer and he also lost right of appeal against the penalty conferred upon under this Act. The Indian felt that the Rowlett Act was a poor reward for the sacrifices that Indians had made during the 1st World War for the British cause. Khalid bin Sayeed, Pakistan A Formative Phase, P. 46

23. Dyer was commissioned in the West Surrey Regiment in 1885 and subsequently transferred to the Indian Army. HE campaigned in Burma in 1886-87 and took part in a blockade of Waziristan in 1901-02. During World War 1st (1914-18) he had a charge of the Eastern Persian cordon, the purpose of which was to prevent German crossings into Afghanistan. He was serving as a brigade commander at Jullundur at the time of Amritsar Massacre (April 13, 1919), when his troops killed unarmed Indian protestors in an enclosed area, apparently in retaliation for the killing of four Europeans and the beating of a woman missionary. As a result Dyer was removed from command into enforced retirement. No doubt, the matter gained international attention and Indian nationalists turned the site into martyrs memorial. Comy Carr, "Dyer" Encyclopedia Britannica, Vol, 4, P. 309
24. Khalid Bin Sayeed, Pakistan The Formative Phase, PP. 46-47
25. Hafeez-Ur-Rehman, Saints and Shrines in Pakistan, P. 405
26. Khalid Bin Sayeed, Pakistan The Formative Phase, PP. 92-99
27. Allam Iqbal, Bal-i-Jibreal, pp. 158-59
28. Fadil Khan, Mehre-e-Munir, PP. 271-273

❍❍❍